ہزار سال پہلے

جزیرہ نمائے پاک و ہند، اسلامی ممالک اور چین کے تہذیبی و تمدنی
حالات کا مجموعہ، جو چوتھی اور پانچویں صدی کے سیاحوں نے مشاہدہ
کئے اور اپنے سفرناموں اور تالیفات میں ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیئے

مصنفہ
علامہ مناظر احسن گیلانی
سابق صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ

نفیس اکیڈمی
بلاسس اسٹریٹ ـــــــ کراچی ۱

۱۹۷۰ء

طبع اوّل۔ ہندوستان میں۔ سنہ ۱۹۵۰ء

طبع دوم۔ نفیس اکیڈمی کراچی۔ سنہ ۱۹۶۴ء

(مطبوعہ)
(جاوید پریس کراچی)

فہرست عنوانات

چین

عام اسلامی ممالک



تاریخی یادداشتیں

(از محمد اقبال سلیم گاہندری)

جزیرہ نما ئے پاک و ہند، اسلامی ممالک اور چین کے تہذیبی و تمدنی حالات کا مجموعہ جو چوتھی اور پانچویں صدی کے سیاحوں نے مشاہدہ کئے اور اپنے سفر ناموں اور تالیفات میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دے۔

یہ کتاب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں آج سے ہزار سال پہلے کے سیاسی، تمدنی اور تہذیبی حالات دکھائی دیتے ہیں، مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے ابن حوقل، البشاری مقدسی، سلیمان تاجر ابن خزداذبہ، مورخ مسعودی اور علامہ قلقشندی کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جو یادداشتیں مرتب کی تھیں، یہ کتاب اُن ہی یادداشتوں سے بن کر تیار ہوئی ہے۔ مولانا مرحوم کی یہ خصوصیت اس کتاب میں بھی پوری طرح ظاہر ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے عمدہ اور معلومات افزا نتائج پیدا کر لیتے ہیں، منتشر اجزاء سے ایک پوری تصویر تیار کر لینے میں انہیں کمال حاصل تھا اور اُن کا یہ کمال اس کتاب میں بھی پوری شان دل ربائی کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔

عام طور پر یہ تھا کہ مصنفین شہروں اور علاقوں کا مختصر طور پر ذکر کرتے

ہوئے واقعاتی انداز میں وہاں کے کچھ نہ کچھ حالات بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً فلاں قسم کا غلّہ دیکھا، فلاں طرح کا پھل نظر آیا۔ پکارنے میں فلاں نام کو یہ لوگ اس طرح بگاڑ کر تلفظ کرتے تھے، وغیرہ وغیرہ، مولانا مرحوم نے اس قسم کے بیانات سے اس زمانہ کی زرعی ترقی، فن باغبانی اور رب ولہجہ پر استدلال کرکے اُس وقت کی پوری تصویر تیار کر دی، اور ایسی عمدہ تصویر بنا دی کہ سارے خط وخال واضح نظر آنے لگے۔

یہ کتاب بے انتہا دلچسپ اور بہت ہی معلومات افزا کتاب ہے۔ ایک مرتبہ ضرور پڑھنا چاہیئے۔

مقدمہ

ما قدر اللہ فسوف یکون کے تجربات سے تو ساری زندگی ہی بھری ہوئی ہے مگر اس قانون کے ظہور کی نوعیت بعض دفعہ عجیب ہوتی ہے۔

بعض تعلیمی ضرورتوں کے لئے مسلمان جغرافیہ نویسوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا، ان کتابوں میں بعض دلچسپ چیزیں نظر آئیں۔ وہ خود بھی دلچسپ تھیں۔ اور قیل و قال چون و چرا کی مشق مدرسوں میں جو کرائی جاتی ہے۔ اسی مشق کا شاید نتیجہ یہ ہے کہ مختلف نتائج کی طرف ان کو پڑھ کر دماغ منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ بغیر کسی ترتیب کے بطورِ یاد داشت کے ان معلومات کو بھی اور جن نتائج کی طرف ان معلومات سے ذہن منتقل ہوتا تھا۔ دونوں کو خاکسار قلم بند کرتا چلا گیا۔ یاد داشتوں کا یہ مجموعہ کئی سال سے پڑا ہوا تھا،

له پرانی تعلیم کی خوبی یا عیب کچھ بھی اسے سمجھئے" قال اقول" نام کی کتاب ہی مشہور ہوئی میر باقر نے ملاؤں کے نام ہی "لم لا یکون" یعنی لم لا یکون کذا (ایسا نہیں ہو سکتا) رکھ دیا تھا ۱۲ منہ

حیدرآباد کے ایک ناشر[1] کی نظر سے گذرا تو انہوں نے شائع کرنیکا ارادہ بھی کیا مگر اس ارادی کے کچھ ہی دن بعد حیدرآباد تاریخ کے ایک ایسے دور میں داخل ہو گیا کہ نہ ناشر صاحب کا وہاں پتہ تھا اور نہ ان کے تجارتی کتب خانہ کا، خود کتاب کیا ہے، کیسی ہے، متفرق یادداشتوں کے کسی مجموعہ کی جو حالت ہوسکتی ہے وہی حال اس کا ہے، تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ معلومات اور معلومات سے بھی زیادہ ان سے نکالے ہوئے نتائج پڑھنے والوں میں انشاء اللہ تعالیٰ کچھ نہ کچھ اثر اپنا ضرور چھوڑیں گے۔ اگر میرا یہ حسن ظن پورا ہوا تو جواز اشاعت کی اسے ایک اچھی افادی وجہ قرار دوں گا۔ مرتب ضخیم کتابیں تو لوگ پڑھتے ہی رہتے ہیں کیا ہوا اگر مذاق بدلنے کے لئے کسی پراگندہ دفتر پر بھی نظر ڈالی جائے ؎

در باغ عقل تخم بہ ترتیب کاشتند　　صحرای عشق ہیں کہ چہ مستانہ رستہ است

زیادہ تر اسمیں مسلمان جغرافیہ نویسیوں اور سیاحوں کے معلومات و مشاہدات ہی ملیں گے لیکن ان یادداشتوں کو قلم بند کرتے ہوئے کسی دوسری کتاب کی دقت پر کوئی مناسب بات اگر یاد آگئی تو اس کو بھی میں نے درج کیا ہے، ابن سعد یا قشقلندری وغیرہ کی کتابوں سے جو خبریں لی گئی ہیں ان کی نوعیت یہی ہے۔

آخر میں کتاب کے پڑھنے والوں سے یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس کتاب کی تصنیف جس شخص کی طرف منسوب کی گئی

---

[1] محمد اقبال سلیم گاہندری مالک نفیس اکیڈمی حیدرآباد حال کراچی مراد ہیں

ہے وہ بیچارا نہ تو کوئی پیشہ ور مصنف ہے اور نہ تاریخ وجغرافیہ کا باضابطہ طالب العلم، پرانے قسم کے عربی مدارس کے دقیانوسی ملاؤں میں سے ایک ملا ہونے کے سوا اسکی کوئی دوسری حیثیت نہیں ہے انہی مدارس میں طالب العلمی کی زندگی پوری ہوئی، اور طالب العلمی کے بعد معلمی کا کام جامعہ عثمانیہ میں انجام دیتا رہا وہاں بھی وہی قرآن فقہ وحدیث کلام وغیرہ کی کتابیں شعبہ دینیات میں پڑھاتا رہا۔ اسلئے عصری خصوصیتوں سے اگر اس کا کام عاری اور خالی نظر آئے تو اس پر نہ تعجب کرنا چاہیئے اور نہ اس کو مورد شناعت وطعن بنانا چاہئے کہ قوم نے جس قسم کی تعلیم دلوائی یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

تعارف کی ان سطروں کے بعد جی چاہتا ہے کہ ایک خاص مسئلہ کے ذکر پر اپنے اس مقدمہ کو ختم کر دوں۔

جس زمانے میں یادداشتوں کا یہ مجموعہ قلم بند ہوا ہے اس وقت ملک کے دو بڑے طبقوں کے درمیان ان زہرہ گداز، جاں سوز، روح گسل واقعات کا ظہور نہیں ہوا تھا جنہیں شاید کبھی سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا مگر ان ہی کو دیکھنا پڑا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے سلجھے ہوئے تعلقات جو صدیوں سے دونوں قوموں میں قائم تھے اچانک ان ہی کو کس الجھانے والے نے الجھا دیا۔

آپ کو اس کتاب میں بھی مشاہدات ومعلومات کا ایک ذخیرہ ملے گا جن سے سمجھا جا سکتا ہے کہ آج ہی نہیں ہمیشہ سے مسلمانوں نے سرزمین ہند اور اس کے باشندوں کو کتنی قدر وعزت کی نگاہ سے دیکھا اس ملک کی

عام مروجہ بت پرستی جو شاید سب سے زیادہ مسلمانوں کے لئے باعث گرانی ہوسکتی تھی، مگر حضرت عبداللہ بن مسعود صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک مورخ کی وہ توجیہہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے جس کا ذکر ہندوستان کی بت پرستی کے متعلق انہوں نے کیا ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ اپنی آسمانی مقدس کتاب قرآن کے متعلق شروع سے مسلمانوں کے اہلِ علم طبقہ میں اس دعویٰ کو حسن قبول حاصل ہو رہا ہے کہ منجملہ دوسری زبانوں کے قرآن میں ہندی زبان کے بعض الفاظ بھی پائے جاتے ہیں اتقان وغیرہ کتابوں میں ان ہندی الفاظ کی آپ کو فہرست بھی مل سکتی ہے، یہ الگ بحث ہے کہ واقع میں ہندی الفاظ یا ہندوستان میں بولی جانیوالی زبانوں میں سے کسی زبان کے وہ الفاظ ہیں بھی یا نہیں لیکن اس سے مسلمانوں کی اس پاک ذہنیت کا تو اندازہ ہوسکتا ہے جو ہند اور سند کی خبروں کے متعلق ابتدا ہی سے وہ رکھتے تھے۔

کیا ایسی زبان جسے وہ ناپاک یا ملیچھوں کی زبان سمجھتے ہوں اس کے الفاظ کی گنجائش اپنے مقدس قرآن میں ان کا دل پیدا کرسکتا تھا؟ بخاری جیسی کتاب جس کا درجہ تقدس و احترام میں قرآن کے بعد ہی مسلمانوں میں مانا جاتا ہے اسمیں آپ کو ایسی روایتیں مل سکتی ہیں کہ ہندوستان کی نسبت کی تصریح کے ساتھ یعنی ہندوستان کی فلاں دوا کو چاہیئے کہ لوگ استعمال کریں۔ یہ حکم ان کے پیغمبر نے اپنی امت کو دیا ہے اور آثار و اخبار کی عام کتابوں میں جو ذخیرہ اس باب میں پایا جاتا ہے ان کے

لئے تو ایک مستقل مضمون ہی میں گنجائش نکل سکتی ہے اس سے زیادہ آخر آپ کیا چاہتے ہیں کہ کعبہ کی دیوار کا جو پتھر "حجر اسود" کے نام سے موسوم ہے اسکے متعلق مسلمانوں کی کتابوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ عرب میں یہ پتھر ہندوستان سے آیا تھا[۱] (دیکھو عینی شرح بخاری وغیرہ) واقعہ کی نوعیت سے مجھے بحث نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے ان احساسات کو دکھانا چاہتا ہوں جو ہندوستان کے متعلق عموماً ابتدا ہی سے ان میں پائے جاتے تھے۔

اور میں تو کہتا ہوں کہ نعیم بن حماد کے حوالے سے ہمارے ہاں کی عام کتابوں مثلاً عقد الفرید وغیرہ میں ہندوستان کے ایک راجہ کا جو خط بنام سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا جاتا ہے جس کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اپنا تعارف کراتے ہوئے اس ہندی حکمران نے لکھا تھا کہ:۔

> یہ خط راجہ راجگان (ملک الاملاک) کی طرف سے ہے جو ایک ہزار راجگان کا بیٹا ہے (یعنی ہزار پشتوں سے راجہ ہے) اور ہزار راجواڑوں کی لڑکیاں اس کے عقد ازدواج میں ہیں اور اس کے فیل خانے میں ہزار ہاتھی ہیں اور وہ ایسے دو دریاؤں کا مالک ہے جنکے پانی سے عود الوہ (خوشبو جلانے کی لکڑیاں) اور جائے پھل، کافور وغیرہ جیسی چیزوں کی

---

[۱] یہ نتیجہ اس بنیاد پر نکالا گیا ہے کہ جنت سے حضرت آدم ہندوستان میں سب سے پہلے اس پتھر کو اپنے ساتھ لائے اور وہاں سے عرب پہنچا ۱۲

ہزار سال پہلے پیدائش ہوتی ہے جنکی خوشبو کی لپٹ بارہ میل تک پہنچتی ہے" (عقد الفرید ج ۱ صـ ۱۴)

خدا جانے اس خط کی نوعیت کیا ہے لیکن کم از کم اس سے اس کا تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان اور اس کے حکمرانوں کی شان و شوکت اور عظمت و دولت کے متعلق اسلام ہی میں مسلمانوں کے اندر عقیدت کے کیسے عجیب و غریب جذبات و خیالات پائے جاتے تھے۔

اور یہی کیا جمال الدین القفطی نے اپنی کتاب تاریخ الحکماء میں بھی اس لطیفہ کا جو ذکر کیا ہے کہ دنیا کے پانچ بادشاہوں یعنی چین[1]، ہند[2]، ترک[3]، ایران[4]، روم[5]، ان کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ساری دنیا کے حقیقی حکمران یہی پانچوں ہیں باقی ان کے سوا جو بھی ہیں وہ اتباع (یعنی ان ہی پانچوں میں سے کسی ایک کے تابع اور طفیلی ہیں)

پھر ان عالمی سلاطین کی خصوصیتوں کو بتلاتے ہوئے جمال الدین نے نقل کیا ہے کہ:-

وکانوا یسمون ملک الہند ملک الحکمۃ لفرط عنایتہم بالعلوم صـ ۱۷۵

اور ہندوستان کے بادشاہ کی خصوصیت سمجھتے تھے کہ وہ حکمت و دانش کا بادشاہ ہے کیونکہ علوم و فنون کی طرف غیر معمولی اور حد سے گذری ہوئی توجہ ہند کے بادشاہوں کو ہے۔

واللہ اعلم بالصواب تاریخ کے کس دور کا یہ قصہ ہے لیکن مجھے

تو یہ بتانا ہے کہ ہندوستان کے متعلق مسلمانوں کا سینہ کتنا کھلا ہوا تھا۔ اسکی یہ کتنی کھلی دلیل ہے۔ کرہ زمین کے پانچ بادشاہوں میں ایک بادشاہ ہندوستان کا بھی بادشاہ تھا، صرف یہی نہیں بلکہ انسانیت کا سب سے بڑا امتیاز یعنی "علم" اس کی قیادت بھی اسی ملک کے حکمرانوں کو حاصل تھی۔ بتایا جائے کہ اعتراف فضل وکمال کی اس سے بہتر شہادت اور کیا ہوسکتی ہے قفطی نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے:

دنیا کی تمام پرانی قوموں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ حکمت و دانش اور مختلف علوم وفنون میں ہندوستان کے لوگ آگے بڑھے ہوئے تھے (ص ۱۷۵)

پھر جس زمانہ میں اپنی یہ کتاب قفطی لکھ رہا ہے یعنی ساتویں صدی ہجری (بارہویں عیسوی) میں ہندوستان کے متعلق جو مسلمانوں کا عام احساس تھا اس کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے:

ہر زمانہ میں یہ مانا چاہیئے کہ ہندوستان کو حکمت و دانش کے سرچشمہ ہونے کی حیثیت حاصل رہی ہے اور عدل و انصاف کا بھی نیز سیاست کا بھی مرکز یہ ملک بنا رہا ہے

اس کے بعد اس ملک کے خصوصی فنون مثلاً ریاضیات، موسیقی وغیرہ کا تذکرہ کر کے ہندی طریقہ حساب کی تعریف کر کے اپنے ذاتی تاثر کو ان لفظوں میں درج کیا ہے:

یہ حساب کرنے کا مختصر ترین طریقہ ہے ایسا طریقہ جسے

ہزار سال پہلے
بہت آسانی کے ساتھ سیکھ لیا جا سکتا ہے، بآسانی گرفت
میں آجاتا ہے۔

آخر میں لکھتا ہے:۔
اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ہندوستان کے لوگوں
کی طبیعتیں کتنی تیز اور ذکاوت سے لبریز ہیں، بات سے
بات پیدا کرنے اور مختلف چیزوں میں سے سب سے
اچھی چیز کے انتخاب کا کتنا اچھا سلیقہ ان میں پایا جاتا
ہے ص ۱۷۵

خواہ کچھ بھی سمجھا جائے لیکن مسلمانوں کی جلبی کتابوں کے پڑھنے کا
موقعہ اب تک مجھے ملا ہے، ان میں زیادہ تر اسی قسم کی شہادتیں اور
مسلمانوں کے اعترافات پائے جاتے ہیں۔ ابوالفداء کی تاریخ میں
ہندوستان کے مختلف طبقات اور مذاہب وملل کا ذکر کرکے آخر
میں "البراہمۃ" کا عنوان قائم کرتے ہوئے ان کی خصوصیتوں کا اظہار ان
الفاظ میں کیا گیا ہے۔
ان لوگوں کے نزدیک فکر (دھیان وگیان) کو بڑی اہمیت
دی جاتی ہے، ان کا خیال ہے کہ محسوس اور غیر محسوس
(غیب وشہادت) کے درمیان واسطہ کا کام فکر
(دھیان وگیان) سے لیا جا سکتا ہے، اس سلسلے میں
یہ بڑی محنت، ریاضت ومجاہدے سے کام لیتے ہیں، تا آنکہ

محسوسات سے منتقل ہو کر غیر محسوس (غیب) سے تعلق پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اس نادیدہ عالم کا ان پر انکشاف ہوتا ہے، لہٰذا اوقات وہ اسی لیے غیب کی خبریں بھی دیتے ہیں، یا ارادے میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ کسی زندہ کے قتل کا ارادہ اس کے قتل کے لئے کافی ہو جاتا ہے (ص ۹۴)

اور بھی اسی قسم کی باتیں اس نے نقل کی ہیں۔

ہندوستان پہونچنے اور اس کو وطن بنا لینے کے بعد ہندوؤں کے مذہب و دین کے متعلق مسلمانوں کی جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی تنقیدی یا مناظرانی کتاب نہیں پائی جاتی، یہ قصہ اس وقت شروع ہوا جب ہندوستان کی حکومت ایک ایسی قوم کے قبضہ میں چلی گئی، جس کی حکمرانی کی بنیاد ہی فرق و احکم (بانٹو اور حکومت کرو) پر قائم تھی۔ تحفۃ الہند اور تحفۃ الہند کے جواب و سوال کا سلسلہ اسی کے بعد شروع ہوا۔

اسی سے اندازہ کیجئے کہ مہاراجہ پٹیالہ کے پاس جب مسٹر [illegible] کمشنر انبالہ بطور مہمان کے تشریف لائے اور بہادر گڑھ کے قلعہ میں مہاراجہ نے ان کو اتارا تو عین محل کے پاس ایک مسجد کو دیکھ کر کمشنر صاحب بہادر نے فرمایا کہ اورنگ زیب تو شوالوں کو ڈھواتا تھا

ہزار سال پہلے
آپ نے اپنے محل کے پاس اس مسجد کو کیسے قائم رہنے دیا۔
مہاراجہ نے جواب میں کہا کہ جس ڈھنگ سے اس وقت آپ
نے اورنگ زیب کا ذکر کیا میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد میرا ذکر بھی
لوگ اسی طرح کریں ص۱۲۲ تاریخ ریاست پٹیالہ مولفہ خلیفہ محمد حسن وزیر
ریاست۔

اگرچہ یہ جزئی واقعہ ہے لیکن یہ بیسیوں کلیات کو جن میں آج
ہندوستان پھنسا ہوا ہے آپ حل کرسکتے ہیں۔ فقط والسلام

مناظر احسن گیلانی

۲۶ مئی سنہ ۱۹۵۰ء
گیلان (بہار)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندوستان

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

ہندوستان کے لحاظ سے یہ وہ زمانہ ہے کہ دار السلام بنا کر مسلمانوں کے بسانے کیلئے اس ملک کا فاتح ابھی کفر کی آغوش اور کفر کے اصلاب میں محو خواب تھا۔ میری مراد سلطان شہاب الدین محمد سام الغوری انار اللہ برہانہ سے ہے۔ ابن حوقل جو میرے اس مضمون کا سب سے بڑا ماخذ بلکہ محرک ہے سنہ ۳۳۶ھ میں پیدا ہوا یعنی چوتھی صدی ہجری کا یہ مصنف اور سیاح ہے وہی سلطان مرحوم کے مرزبوم غور کے متعلق لکھتا ہے:۔

امّا الغور فانما ذکرتہا
فی الاسلام لان بہا مسلمین
(ابن حوقل)

باقی غور تو ابھی کفر ہی کا علاقہ تھا اسلامی ممالک کے سلسلے میں اس کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں کہ کچھ مسلمان اس علاقہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اور گو ہم سندھ کے نام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے

پندرہ سال بعد ہی ایک مہم ہندوستان کی طرف مسلمانوں کی روانہ ہو چکی تھی لیکن باوجود اس کے ابن حوقل کے زمانہ تک ہندوستان کے متعلق مسلمانوں کے معلومات اور تاثرات کا حال یہ تھا، جیسا کہ ابن حوقل ہی نے سندھ اور اطراف سندھ، کچھ، ملتان اور اس کے آس پاس کے قصبوں اور شہروں کا ذکر کر کے جن کے نام اب قریب قریب محو ہو چکے ہیں، یہ لکھا ہے کہ:-

وهذه مدن الهند التي عرفتها ولها بواطن واماكن كقزان وقنوج في المفاوز وهي كمطه واود غشت في اقطار نائية واماكن سحيقة لا يصل اليها تاجر الا من اهلها لانقطاعها وكثرة الآفات المقتطعة لقاصدها

(ابن حوقل ص ۲۲۷)

یہ ہیں ہندوستان کے شہر جنہیں میں جان سکا ہوں، ان کے سوا ملک کے اندرونی علاقے بھی ہیں، مثلاً قزان، قنوج جو ریگستانوں کے اندر ہیں۔ ان کی حالت بجنسہ مغربی افریقہ کے دور دست علاقوں کی ہے یعنی لمط اور غشت وغیرہ۔ ہندوستان کے ان اندرونی شہروں میں کوئی تاجر نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ اگر خود ان ہی ہندوستانیوں میں سے ہو تو اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ (اسلامی ممالک سے) ہندوستان کے یہ اندرونی شہر بالکل منقطع ہیں۔ اور راستے میں بکثرت ایسی آفتوں سے ان لوگوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے جو اندرون ملک کے ان شہروں کا ارادہ کرتے ہیں۔

فرزان کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا کہ کس شہر کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ واللہ اعلم، اب اس نام کی کوئی آبادی کہیں موجود بھی ہے یا نہیں۔ البتہ قنوج کو ابن حوقل جانتا ہے مگر کیا جانتا ہے "المفاوز" یعنی صحرائے سندھ کے درمیان کا ایک شہر انہیں کو بتاتا ہے۔ خیال گزرتا ہے کہ سندھ تک مسلمان یلغار کر کے پہونچ گئے تھے، حالانکہ یہاں تک بھی پہونچنا آسان نہ تھا کہ مکران سے مکران تک عظیم "مفازہ" یعنی صحرائے ریگ کو عبور کر کے وہ یہاں تک پہنچے تھے، مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اندلس پہنچکر موسیٰ بن نصیر فاتح اندلس نے بحرِ محیط کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ "تیری موجیں اجازت نہیں دیتیں ورنہ اللہ کا کلمہ بلند کرتے ہوئے میں آگے ہی بڑھتا چلا جاتا لیکن مجبوراً واپس ہوتا ہوں" کچھ اسی طرح جنوب میں بحرِ عرب اور بحرِ ہند کی موجیں، شمال میں ہمالہ کی بلند چوٹیاں، سامنے ایک لق و دق ریت اور بالو کا غیر آباد صحرا، اسی کو دیکھ کر آگے بڑھنے کی ہمت مدتوں ان میں پیدا نہیں ہو سکی۔ ماسوا اس کے جیسا کہ ابن حوقل نے بھی اشارہ کیا ہے۔ کہ اس ملک میں وہی تاجر داخل ہو سکتا ہے جو انہی میں سے ہو، چھوت چھات، جات پات کے مسئلے نے ہندوستان میں مسافروں کیلئے کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑی ہوگی بلکہ الہمدانی جو تیسری صدی ہجری کا مصنف ہے اسکے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بابروں نے بعض عجیب و غریب ڈراؤنی باتیں بھی مشہور کر رکھی تھیں، اس لئے ایک موقع پر لکھا کہ:

وبين خراسان وارض الهند	خراسان اور ہندوستان کے درمیانی راستہ
نمل مثل الكلاب السلوقيه[1]	میں ایک قسم کی چیونٹیاں ہیں جو شکاری کتوں
(ابن الفقیہ الہمدانی ص ۳۲۵)	کے برابر بڑی ہوتی ہیں۔

[1] [illegible]

پھران کی تفصیل بھی لکھی ہے کہ کس طرح لوگوں پر حملہ کرتی ہیں اور ان کے حملے سے بچنے کی تاجروں نے کیا صورتیں اختیار کر رکھی ہیں۔

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن حوقل کے زمانہ تک سندھ و ملتان اور اس سے بھی جو بالائی علاقے ہیں، نیز ساحلِ سمندر کی بندرگاہیں اور ساحل سے قریب کے شہروں سے تو مسلمان خوب واقف تھے۔

(حاشیہ پچھلا) ہندوستان کے متعلق جہاں تک سننے میں آیا ہے اس وقت تک یورپ کے عوام میں اسی قسم کی باتیں مشہور ہیں، مختلف حضرات جو یورپ سے تعلیم پا کر واپس آئے ہیں اُن سے معلوم ہوا کہ عام طور پر لندن تک کے عوام عموماً دریافت کرتے ہیں کہ آخر ہندوستانی سانپوں اور شیروں کے درمیان کیسے رہتے ہیں! میرے ایک دوست جو جامعہ عثمانیہ میں سائنس کے استاد تھے، وہ کہتے تھے میں بھی ان کو یاد کرانا پڑتا تھا کہ شام ہوتے ہی ہم لوگ اپنے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ اتفاقاً کسی دن دروازہ کھلا رہ جائے تو شیر ہمارے بچوں کو اٹھا کر لے بھاگتے ہیں اور سانپوں کا یہ حال ہے کہ ہم لوگ پلنگ پر لیٹے نہیں کہ بکثرت سوراخوں سے سانپ نکل نکل کر ادھر اُدھر صحن میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ سر راس مسعود مرحوم بھی اپنا ایک قصہ کہتے تھے غالباً لندن ہی کا کہ عورتوں اور مردوں کا ایک مجمع تھا مجھے خدا جانے کیا سوجھی۔ کسی کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ جس حال میں مجھے آپ لوگ دیکھ رہے ہیں اس پر میرے بزرگوں کو قیاس نہ کیجئے۔ واللہ اعلم اُن کا بیان تھا کہ میں نے جب ان کو یاد کرایا کہ پہلے آدمی جو درخت سے اُتر کر زمین کی زندگی گزارنے کے عادی ہوئے وہ میرے دادا تھے۔ ورنہ ان سے پہلے سب درختوں ہی پر رہتے تھے۔ تو لوگ چاروں طرف سے جمع ہو کر بطور تماشا کے مجھے دیکھنے لگے یعنی ایک ایسے آدمی کو دیکھ رہے تھے جس کی نسل دو پُشت زمین پر رہنے کی عادی ہوئی ہے ۱۲

سندھ کا شہر منصورہ

وہ سندھ کے مرکزی شہر منصورہ (جس کا نام سندھیوں کی زبان میں برہمن آباد تھا) کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے وہاں کے امیر کا، عام باشندوں کا، انکے طرز رہائش کا، موسم کا، پیداوار کا، سب ہی کا تذکرہ اس نے کیا ہے۔ مسلمانوں کا جو خاندان اُس کے زمانہ میں منصورہ کا امیر تھا اس کے متعلق ابن حوقل نے لکھا ہے کہ:۔

وملكهم من قريش	اُن کا بادشاہ قریشی نسل سے ہی یعنی ہبار
من ولد هبار بن الاسود	بن اسود کی اولاد ہے۔ اس شہر پر اسی قریشی
قد تغلب عليها	بادشاہ کے بزرگوں نے قبضہ جما لیا تھا
اجداده وساسوهم	اور پھر وہاں کے باشندوں پر ایسی
سياسة اوجبت	حکومت ان لوگوں نے کی جس کی وجہ سے
رغبة الرعية فيهم	رعیت ان کی طرف مائل ہوگئی اور دوسروں
وايثارهم على من سواهم	پر ان لوگوں کو وہاں کے باشندے ترجیح
غير ان الخطبة لبني	دینے لگے۔ البتہ خطبہ اس شہر میں عباسیوں
العباس (ابن حوقل ص ۳۲۸)	ہی کے نام سے پڑھا جاتا ہے۔

یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں کا عام لباس تو اس ملک میں وہی ہے جو عام عراق والوں کا لباس ہے۔ لیکن صرف شاہی خاندان کے لوگ:۔

يقارب زيهم زي ملوك الهند   بال اور کرتے ان کے ہندوستان کے راجگان

فی الشعور والقراطق (ابن حوقل ص۲۲۸) کی وضع کے قریب قریب ہیں۔

ملتان

اسی طرح سے ملتان کا تذکرہ بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے لکھا ہے کہ مسلمان اس شہر کو فرج بیت الذہب کے نام سے موسوم کرتے ہیں یعنی سونے کے گھر کا شگاف، گو وجہ تسمیہ اس کی ابن حوقل نے یہ بتائی ہے کہ:-

لانها فتحت فی اول الا	ملتان اُس زمانہ میں فتح ہوا تھا جب
سلام وکان	اس ملک میں اسلام ابتداءً داخل ہوا تھا
بالمسلمین ضیق	اُس وقت مسلمان سخت تنگی میں مبتلا تھے
وقحط فوجدوا فیها	اور قحط کے شکار ہو گئے تھے۔ ملتان جب
ذهبا کثیرا	فتح ہوا تو سونے کا ایک بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا
فاتسعوا۔	جس سے فراغ بالی پیدا ہو گئی۔

"ہندوستان سونے کی چڑیا ہے" شاید اسی کا ترجمہ مسلمانوں نے ان الفاظ میں کر لیا ہو۔ اسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے تک اس تمام علاقے میں یعنی سندھ، ملتان وغیرہ میں زیادہ تر بدھ مت کے پیرو آباد تھے وہ چند مجہول الاسم شہروں کے نام لے کر لکھتا ہے کہ:-

فمن صیمور وقاهل من بلد	صیمور اور قاهل جو ہندوستان کے
الهند ومن قاهل الی مکران	(ساحلی) شہر ہیں۔ قاهل سے مکران
قلیل بدهة والکفار فی هذه	تک بدھ لوگ آباد ہیں۔ اسی طرح سندھ

السند ھم البدھ . . . والبدھۃ	کے علاقوں میں بدھ ہی آباد ہیں
قبائل مفترشۃ ما بین حدود	اسی طرح طوران اور مکران وملتان
طوران ومکران والملتان ومدن	میں بدھ قبائل کے لوگ پھیلے
المنصورۃ (ابن حوقل ص۲۳۱)	ہوئے ہیں۔

طوران مکران ہی کے قریب بلوچستان کے کسی علاقہ کا نام تھا، لکھا ہے کہ اس کا امیر بھی الگ ہے جس کا نام ابوالقاسم البصری ہے، اسی طرح وہ ملتان کے حالات میں لکھتا ہے کہ:۔

امیرھم قرشی من ولد اسامۃ	ملتان کا امیر بھی ایک قریشی ہے اسامہ
بن لوی قد تغلّب علیھا اولو	بن لوی کی اولاد میں ہے۔ ملتان پر
(ابن حوقل ص۲۳۰)	اس کے بزرگ قابض ہو گئے تھے

پنجاب میں قریشی یا قرشی کی نسبت اپنے ناموں کے پیچھے استعمال کرنے والے حضرات کیا ان ہی سندھی وملتانی سلاطین وامراء سے کوئی نسبی تعلق رکھتے ہیں؟ واللہ اعلم بالصواب۔

اسی ملتان کے سلسلے میں اسی ابن حوقل نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہاں ایک عظیم اور بہت بڑا بت خانہ ہے جس میں ایک دیوہیکل مورتی ہے غالباً یہ بدھ ہی کا بت ہے۔ ابن اثیر میں ہے:۔ کل ما یعبد فھو عندھم بدّ (ہر وہ چیز جو پوجی جاتی ہے ہندوستانیوں کے یہاں "بد" کہلاتی ہے)

بعضوں کا یہ خیال کہ بت کا لفظ اسی "بدھ" ہی کا ایک تلفظ ہے میرے خیال میں بھی قابل قبول ہے۔ مگر دلچسپ قول اس ملتانی "بد" کے متعلق ابن اثیر

نے یہ نقل کیا ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ حضرت ایوب علیہ السلام کی مورتی یعنی صنم یا مجسمہ ہے۔

دوسری کتابوں میں بھی البدا لعظمٰی کے نام سے مورخین نے ملتان کے اس بت کو موسوم کیا ہے۔ اس بت کا پورا نقشہ اور حلیہ بھی ابن حوقل نے کھینچا ہے۔ دلچسپ دو باتیں لکھی ہیں۔ ایک تو وہی جو سلاطین اسلام کا ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ دوامی سلوک[1] رہا یعنی اس بت کا ذکر کر کے رقمطراز ہے :-

وامیر الملتان ینفق علی السدنہ منہ (ابن حوقل ص ۲۲۹)	جو آمدنی امیر ملتان کو ہوتی ہے اس میں سے وہ اس بت خانہ کے پجاریوں پر بھی خرچ کرتا ہے۔

اور دوسرا لطیفہ جو اس نے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ گو ہندوستان کی لامحدود مخلوق کے مقابلہ میں اس امیر ملتان کے پاس کوئی ایسی فوجی قوت نہیں ہے جس سے حملہ کرنیوالوں کی وہ مدافعت کر سکتا ہو لیکن ترکیب یہ اس نے اختیار کر رکھی ہے کہ

اذا قصد ھم	جب ہندوستان کے باشندے ملتان کے
الھند للحرب	اس مسلمان امیر کی طرف جنگ کے ارادے سے
وانتزاع ھذا	حملہ کرتے ہیں اور اس مورتی کو (جو ملتان میں
الصنم منھم اتوا	تھی) اس سے چھین لینا چاہتے ہیں تو مسلمان
الصنم فاظھروا	اس مورتی کے پاس آ کر کچھ ایسی حرکتیں کرتے
کسرہ واحراقہ	ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ (اگر بڑھنے والے

[1] وہی دوامی اور عام سلوک جسے یاد کر کے بے ساختہ میری زبان پر شاعر کا یہ شعر جاری ہو جاتا ہے ؎

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو ۔۔۔ تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

فیہ جحوت — اگر آگے بڑھے تو ان کے اس بت کو وہ توڑ

ولولا ذلك — پھوڑ کر رکھ دینگے اور جلا دینگے (اس حال کو

لخربوا — دیکھکر حملہ کرنیوالے واپس ہو جاتے ہیں

الملتان — اگر ایسی صورت نہ ہوتی تو ملتان کو

(ابن حوقل) — ہندوستان والے تباہ و برباد کر چکے ہوتے

پھر آگے پیچھے خدا جانے کتنے شہروں کے نام اس نے لئے ہیں مثلاً قلری، بکری، اتری، مسودھی، بانیہ وغیرہ۔ اور عجیب بات یہ لکھی ہے کہ:۔

وملتان اهل المنصورة والملتان — منصورہ اور ملتان اور جو علاقے ان

ونواحيها العربية والسندية — کے آس پاس ہیں ان کی زبان

(ابن حوقل ص ۲۳۲) — عربی اور سندھی ہے

گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ عربی زبان ہندوستان کے سندھی خطہ تک پہونچ چکی تھی۔ پھر مکران کا تذکرہ کرکے بتایا ہے کہ وہاں بھی ایک الگ امیر ہے جس کا عیسٰی بن معدان ہے، پایۂ تخت کا نام اسکے کیز ہے۔ شاید اسی کو آجکل کوئٹہ کہتے ہوں۔ پھر آگے قندابیل وغیرہ نامی شہروں کا ذکر کرکے یہاں بھی یہی بتایا ہے کہ "فیہ مسلمون وکفار من البدھ" (یعنی اس علاقہ میں بھی مسلمان اور بدھ مت والے رہتے ہیں) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری تک یہ سارا علاقہ بدھ مذہب والوں سے بھرا ہوا تھا اور غالب قرینہ بھی یہی ہے کہ بتدریج ان ہی بدھوں نے اسلام قبول کیا ہے[1]

---

[1] بدھ مذہب والوں کا اسلام سے عجیب تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ وسط ایشیا کا سارا علاقہ

(بقیہ اگلے صفحے پر)

ساحلی علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کی سیاسی حیثیت

غرض کہ چوتھی صدی ہجری تک مسلمان اس ملک کے متعلق بہت ہلکی سی واقفیت

(بقیہ حاشیہ پچھلا) کابل، قندھار، سندھ، سرحد، اسلام سے پہلے انکے باشندے عموماً بدھ مت کے پیرو تھے، پھر بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام کے آتے ہی بغیر کسی کشمکش کے اچانک انہوں نے اسلام قبول کر لیا آجتک دنیا کو اس پر حیرت ہے۔ البلاذری نے تو تصریح کی ہے کہ کچھ نہیں معلوم کہ یہ کیسے مسلمان ہوئے، گو بعض جستہ جستہ واقعات تاریخوں میں ملتے ہیں لیکن بالکل ناکافی، مسٹر آرنلڈ نے بھی یہاں پہنچکر اپنی مشہور کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں سپر ڈالدی ہے۔ میرا اس باب میں ایک خاص نظریہ ہے جسکی طرف اپنی کتاب "النبی الخاتم" میں میں نے بعض اجمالی اشارے بھی کئے ہیں۔ کاش کوئی اس مضمون کو اپنی تحقیقاتی جد وجہد کا موضوع بناتا۔ بڑے بڑے اسرار اس پر فاش ہو سکتے ہیں۔ تاتاری بھی عموماً بدھسٹ تھے میں تو خیال کرتا ہوں کہ چین اور خصوصاً جاپان کے بودھوں میں کام نہیں کیا گیا اس وقت بڑا نادر موقع ہاتھ آگیا ہے۔ انانیت کا بت جاپان کا ٹوٹ چکا ہے۔ انگریزی زبان سے وہ اتنے قریب ہو چکے ہیں کہ اسی زبان کو ذریعہ بنا کر ان کو اس آڑے وقت میں اسلام کی دعوت دیکر آدمی بنایا جا سکتا ہے بلاشبہ وہ آدمی بننے کا حق رکھتے ہیں۔ وسط ایشیا کے متعلق یہ خیال کہ خوجی حملوں سے وہ مسلمان ہوئے مختلف وجوہ سے غلط ہے۔ ابھی غور کا حال آپ پڑھ چکے کہ چوتھی صدی تک کفر پر وہ مصر رہا لیکن اسلام کی تلوار نے مسلمان ہونے پر اسکو چار سو سال تک مجبور نہیں کیا۔ حالانکہ چاروں طرف ان کے مسلمان ہی مسلمان تھے۔ ۱۲

رکھتے تھے، البتہ ساحلی علاقوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت سے مختلف ہندو راجاؤں کے علاقوں میں بسنا شروع ہو گئے تھے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں بھی مسلمان ہندوستان میں جس شرط کیساتھ لیتے تھے وہ عجیب و غریب ہے ابن حوقل سواحل ہند کے شہروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"کھمبایت سے صیمور تک بلھرا کا علاقہ ہے۔ جو کتاب الامثال کا مصنف ہے اور اپنے علاقہ کے نام کی نسبت سے مشہور ہے جیسے (اقتصے ہیں) غانہ (کانا) کہتے ہیں حالانکہ وہ علاقہ کا نام ہے اسی طرح کانغہ (کانگو) وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔"

بہرحال اسی بلھرا کے علاقہ میں جو مسلمان آباد تھے ان کے متعلق ابن حوقل کا اور اس کے علاوہ دوسرے بعض مورخین کا بھی یہی بیان ہے کہ :۔

وفیھا مسلمون ولا یلی علیھم	بلھرا کے علاقہ میں کچھ مسلمان بھی آباد ہیں
من قبل بلھرا الذی فی زماننا ھذا	ان مسلمانوں پر بلھرا کی طرف سے اس زمانہ
الا مسلم لیتخلفہ علیھم	میں وہی آدمی حاکم ہو سکتا ہے جو مسلمان ہو۔
(ابن حوقل صـ۲۲۷)	بلھرا کا وہ حاکم ان مسلمانوں پر نمائندہ ہوتا ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ حکومت کی جانب سے اس زمانہ میں بھی ہندوستان کے

لہ معلوم نہیں کتاب الامثال سے ابن حوقل کی کیا مراد ہے شاید کلیلہ و دمنہ کی داستان جس میں گیدڑوں کا ذکر بطور مثال کے کیا گیا ہے اور سارے قصے جانوروں ہی کی زبان سے ادا کئے گئے ہیں واللہ اعلم بالصواب جدید تحقیقاتی مضامین میں تو ثابت کیا گیا ہے کہ اصل نام اس کتاب کا "ہیپدیشا" یا "اپدیش" یا "پنچ تنتر" تھا۔ ۱۲

ان گنے چنے مسلمانوں کو اپنے اوپر خود مسلمانوں کی حکومت قائم کرنیکا اختیار دیا جاچکا تھا بلکہ ابن حوقل ان مسلمانوں کے متعلق جو اس زمانہ میں غیر اسلامی حکومتوں کے علاقوں میں آباد تھے سب ہی کا یہی حال بتاتا ہے اس کے الفاظ ہیں :-

وکذلك العادة وجدتها فی کثیر من بلدان الاطراف التی تغلب علیها الکفر کالخزر والسریر واللان وغانه وکوغه	اور یہی حال (یعنی مسلمانوں پر خود مسلمان حکمران ہیں) یہ بات میں نے بہت سے اُن ممالک میں پائی جن پر کفر کا غلبہ ہے مثلاً خزر، سریر، لان، غانہ، کوغہ وغیرہ ہیں۔

پھر اسی کی کچھ اور تفصیل ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :-

لا یقبل المسلمون فی جمیع هذه الانحاء حکم وان یحکم علیهم الا مسلم منهم ولا یتولی حدودهم ولا یقیم علیهم شهادة الا المسلمون وان قلّوا	ان تمام علاقوں میں مسلمان کسی حکم اور فیصلہ کو اُس وقت تک تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جب تک کہ اُن پر خود مسلمان ہی حاکم نہ ہو۔ ان پر حدود اور سزاؤں کے نفاذ کا یا ان پر شہادۃ اور گواہی دلانے کا حق مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ خواہ اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔
(ابن حوقل ص۲۲۸)	

جس کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں پر مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے طبقہ کی حکمرانی کو ان علاقوں میں بھی مسلمان قبول نہیں کرتے تھے جہاں

انتہائی اقلیتِ قلیلہ میں وہ ہوتے تھے۔ اسی لئے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

وبلاد بلھرا مساجد یجمع	بلھرا کے علاقہ میں مسلمانوں کی مسجدیں بھی
فیھا الجمعات وتقام بہا	ہیں جن میں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے اور
الصلوات بالاذان	دوسری معمولی نمازیں بھی پڑھی جاتی ہیں۔
علی المنائر والاعلان	نماز کے لئے میناروں پر اذان دی ہوتی
بالتکبیر والتھلیل	ہے اور تکبیر و تہلیل اعلان کے
(ابن حوقل ص۲۲۸)	ساتھ ادا کی جاتی ہے ۔

اور اسی نوعیت کی دوسری کتابوں میں مثلاً بزرگ بن شہر یار کی کتاب "عجائب الہند" میں لکھا ہے کہ بلھرا کی حکومت میں مسلمانوں کا جو مسلمان افسر ہوتا تھا اس کا لقب ہنرمن تھا۔ بزرگ ابن شہر یار جس زمانہ میں اس علاقہ میں پہنچا ہے اس وقت وہاں ہنرمنی کے اس عہدے پر جو سرفراز تھا اس کا نام عباس بن ماہان بتایا ہے۔ عجائب الہند ص۱۴۳۔ اسی کتاب میں دوسری جگہ الہنرمن[1] کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں :۔

والھنرمن ھو مثل القاضی	اسلامی علاقوں میں جو حیثیت قاضی

[1] بظاہر ہنرمن ہنرمند کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتی ہے۔ خیال گذرتا ہے کہ مسلمانوں کی جو اخلاقی عظمت ہندوستانی حکمرانوں کے قلوب میں قائم ہو گئی تھی شاید اسی سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنے مذہبی پیشوا یعنی "برہمن" کے وزن پر مسلمانوں کے پیشوا کو "ہنرمن" کے لفظ کا خطاب دیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲

فی بلاد الاسلام ولا یکون الہنرمن الا من المسلمین
(عجائب الہند ص۱۶۱)

کی ہوتی ہے وہی حیثیت ہنرمن کو (بلہرا) کے علاقہ میں حاصل ہے لیکن ہنرمن مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے طبقے سے نہیں ہو سکتا

اسی نے لکھا ہے کہ ہندوستانی قوانین کی رو سے کسی جرم کی خواہ کچھ بھی سزا مقرر ہو، لیکن مسلمان جب اس جرم کے مرتکب ہوتے تھے تو ان کو ہنرمن کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے سپرد کر دیا جاتا تھا، تاکہ

یعمل بما یوجبہ حکم الاسلام
(عجائب الہند ص۱۶۱)

اسلامی قوانین کی رو سے ان پر حکم لگائے۔

کیا زمانے کا انقلاب ہے کہ جس زمانے میں مسلمان ہندوستان میں انگلیوں پر بھی بمشکل گنے جا سکتے تھے اُسوقت تو انہوں نے اس ملک میں یہ اختیار اور اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ مسلمانوں پر مسلمانوں ہی کی حکومت قائم ہوگی اور مسلمانوں پر اُن کے دین ہی کا قانون نافذ ہوگا۔ لیکن آج جب ان کی تعداد اسی ملک میں کروڑوں سے بھی متجاوز ہو چکی ہے۔ اس مسئلہ کے خیال کو بھی اپنے دماغ میں لانے کی ہم جرأت نہیں کر سکتے۔ دوسروں سے منوانا تو دور کی بات ہے خود مسلمانوں میں بھی اس پر اتفاق و اجماع ہونا آسان نہیں ہے۔ یہی طے ہونا مشکل ہے کہ اس قسم کے اختیارات کا مطالبہ حکومت کے سامنے مسلمانوں کو پیش کرنا بھی چاہیئے یا نہیں۔ دلوں میں کمزوری ہے۔ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اس مطالبہ کو کون تسلیم کرے گا۔ اور سچ پوچھیے تو اصلی کمزوری دلوں ہی کی کمزوری ہے لیکن باوجود قلت تعداد اور مادی ضعف کے جن مسلمانوں نے ان حقوق کو

حاصل کیا تھا ان کی اندرونی قوت کا اندازہ ابن حوقل ہی کی اس چشم دید شہادت سے ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ان ہی علاقوں میں سے بعض علاقوں میں ایسے مسلمانوں سے بھی میری ملاقات ہوئی ہے جن کی پارسائی اور اخلاقی برتری کا یہ حال ہے کہ اپنے مقدمات میں غیر مسلم طبقات کے افراد بھی عموماً ان کو اپنا گواہ مقرر کر کے حکومت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور مقدمہ کا فریق ثانی بھی عموماً ان کی شہادت کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی کسی خاص گواہ کی گواہی پر فریق ثانی کو اگر اعتراض بھی ہوتا ہے تو اس کی جگہ گواہی میں پھر مسلمان ہی کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ اور اسی کے بیان پر مقدمہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔" (ابن حوقل ص ۲۲۸)

لیکن آج ان ہی حقوق کے حاصل کرنے کا ذریعہ مسلمان جن چیزوں کو بنا رہے ہیں اب ان کے متعلق کیا بیان کروں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ جو چیز دیکھی جا رہی ہے اسے سنایا کیا جائے۔ غیر بھی اعتماد کرتے تھے ایک حال اسی قوم کا اسی ملک میں یہ تھا اور آج اسی قوم کا اسی ملک میں یہ حال ہے کہ ہر مسلمان دوسروں کی دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ عزت و ناموس خود مسلمانوں کی مسلمانوں کے ہاتھ برباد ہو رہی ہے۔ باطنی قوت کے اس افلاس کے بعد ظاہری طاقت پیدا کرنے کی کوشش قطعاً ایک غیر منطقی کوشش ہے۔

اہلِ ہند کی مسلمانوں سے عقیدت

جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں مسلمانوں کے ساتھ اس ملک کے غیر مسلم باشندوں کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ جن چیزوں میں خصوصیت کے ساتھ ہند والوں کو دعویٰ تھا، مثلاً سانپ کے زہر کا ازالہ جھاڑ پھونک، منتر جنتر وغیرہ بزرگ بن شہریار نے کولم ملی (جنوبی ہند کے ایک ساحلی شہر) کے تذکرے میں ناگ سانپ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

ان بکولم ملی رجل مسلم	کولم ملی میں ایک مسلمان ہے جسے ہندوستانی
یسمّی بالھندیۃ بنجی وھو	زبان میں بنجی (یعنی بانگی) کہتے ہیں۔ یہ
صاحب الصلوٰۃ۔ یرقی نھشۃ	ان کی نماز سے تعلق رکھتا ہے (یعنی مؤذن
ھذہ الحیۃ۔	ہے) وہی ناگ سانپ کے زہر کا ازالہ
(عجائب الہند)	اپنے جھاڑ پھونک سے کرتا ہے۔

پھر یہ لکھ کر کہ زہر جب مارگزیدہ کے جسم میں اچھی طرح سرایت کر جاتا ہے تو اس وقت گو اس بنجی یعنی موذن کی جھاڑ سے نفع نہیں ہوتا لیکن عام حالات میں مریض عموماً شفایاب ہو جاتا ہے۔ آخر میں بیان کیا ہے کہ گو اس ملک میں بکثرت ایسے لوگ ہیں جو اس خاص سانپ (الناغران) یعنی ناگ اور اس کے سوا دوسرے سانپوں کے زہر کا ازالہ جھاڑ پھونک سے کرتے ہیں۔

الا ان رقیۃ ھذا المسلم لا تکاد	لیکن اس مسلمان موذن کا جھاڑ بہت
تخطی (عجائب الہند ص ۱۳۰)	کم خطا کرتا ہے۔

واللہ اعلم واقعہ کی صحیح نوعیت کیا تھی لیکن اس قصّہ سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے مؤذنوں تک کے متعلق اس ملک کے باشندوں کا یہ اعتقاد تھا کہ ان کا عمل ان کے جھاڑنے والوں کے عمل سے زیادہ مؤثر اور مفید ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بیان سلیمان تاجر کا ہے مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنے اخلاق کا کتنا وزن اہلِ ہند کے قلوب میں ڈال دیا تھا اس قصّے سے اندازہ کیجئے بلھرا جس کا ذکر ابھی گذرا ہے سلیمان اسی راجہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرنے کے بعد جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:۔

"بلھرا کا راجہ اس ملک کا سب سے بڑا بادشاہ ہے اور تمام راجگانِ ہند اسکے فضل و شرف کو مانتے ہیں۔ اگرچہ ہندوستان کا ہر راجہ اپنے اپنے علاقہ کا مستقل حکمران ہے لیکن بلھرا کی سیادت سب ہی تسلیم کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بلھرا کے سفیر جب کسی راجہ کے پاس پہنچتے ہیں تو سفیر کے سامنے راجہ ڈنڈوت کرتے ہیں، یہ عظمت کے اظہار کا طریقہ ہے۔"

پھر بلھرا کے متعلق اور مختلف باتیں یعنی اس کا سکہ کس قسم کا ہے سن کی ابتدا کس زمانہ سے ہوئی ہے لکھنے کے بعد آخر میں لکھتا ہے کہ:۔

"بلھرا خاندان کے راجگان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بسا اوقات پچاس پچاس سال تک ایک ایک راجہ کو حکومت کرنیکا موقعہ

۱؎ سلیمان کی کتاب میں "صدا دا رسا یہ تقلیما" کے الفاظ ہیں جن کے ڈنڈوت سے مترجم نے کیا ہے ۱۲

اس گدی پر ملجاتا ہے؟

اور یہ برکت ان حکمرانوں کو کس ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے؟ سلیمان لکھتا ہے کہ

تزعم اهل مملكة بلهرا	بلہرا کی حکومت والوں کا خیال ہے کہ
انما يطول مدة ملكهم	ان کی حکومت کی مدت اور ان کی عمر کی
واعمارهم في الملك لمحبتهم	درازی کا سبب یہ ہے کہ عرب سے
للعرب (سلیمان ص۲۷)	یعنی مسلمانوں سے وہ محبت کرتے ہیں

سنا ہے آپ نے اس ملک والوں کا عقیدہ؟ چونکہ عرب یعنی مسلمانوں کے ساتھ بلہرا خاندان کے راجگان محبت کرتے ہیں، اسلئے اللہ ان کی عمروں کو بڑھا دیتا ہے۔ یہ تھا محبوبیت کا وہ مقام جو مسلمان اپنے اخلاق کی بدولت ان ممالک میں حاصل کر لیتے تھے۔ جہاں وہ بیچارے صرف مسافروں اور تاجروں کی حیثیت سے پہونچتے تھے کہ نہ صرف وہی بلکہ اُن کی قوم تک دوسروں کی محبوب بن جاتی تھی اور کیسی محبوب کہ خدا کی ساری مہربانیوں کو اسی محبت کا نتیجہ قرار دیتی تھی۔ کیا بجائے مغربی طریقوں کے مسلمان دوسری قوموں کی محبت کو اپنی پرانی راہوں سے نہیں حاصل کر سکتے!

میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ یہ حال کچھ ایک بلہرا اور اس کے ملک کی باشندوں ہی کا نہیں تھا۔ ابن حوقل کے حوالے سے یہ بات گذر چکی ہے کہ جہاں کہیں بھی اس زمانہ میں مسلمان پہونچتے تھے کچھ ایسا اثر اس ملک کے باشندوں اور حکمرانوں پر ڈال دیتے تھے کہ بخوشی و رضا وہاں کے حکمران مسلمانوں پر حکومت کرنے کا اختیار خود مسلمانوں کے سپرد کر دیتے تھے۔ سلیمان تاجر ہی نے چین کا تذکرہ کرتے ہوئے

بیان کیا ہے کہ:-

"شہر خانفو جو چین کے مسلمان تاجروں کا مرکزی مقام تھا
یہاں بھی چین کے بادشاہ نے مسلمانوں پر حکومت اور انکے
متعلق فصل خصومات کے اختیارات کو ایک مسلمان
ہی کے سپرد کر رکھا ہے"

اس کے بعد لکھا ہے کہ یہی مسلمانوں کا "والی"

اذا کان فی العید صلی	عید کے دن مسلمانوں کو وہی نماز پڑھاتا
بالمسلمین وخطب ودعا	ہے اور خطبہ پڑھتا ہے اور مسلمانوں کے
لسلطان المسلمین وان	سلطان (خلیفہ) کے لئے دعا کرتا ہے
التجار العراقیین لا	عراق کے مسلمان تجار چینی حکومت کے
ینکرون من ولایته	اس مسلم والی کی حکومت اور اس کے
شیئاً فی احکامه وعمله	احکام کا انکار نہیں کرتے اور حق پر اس کا
بالحق وفی کتاب الله عزّ	عمل ہے۔ اللہ کی کتاب کے مطابق اور
وجلّ واحکام الاسلام	اسلامی قوانین کے مطابق وہ فیصلہ کرتا
(سلیمان ص۱۴)	ہے اس پر بھی کسی کو اعتراض نہیں ہے۔

جنہوں نے یورپ سے سیاست کا علم سیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ سیاست کا علم صرف انہی کی ذات قدسی صفات میں منحصر ہے۔ اُن کو سننا چاہیئے کہ وہی عید کی نماز اور جنازوں کی نماز پڑھانے والے خطبہ دینے والے مسجد کے ملانے تیغ و تفنگ اقلیت کی انتہائی مشکلوں میں بھی وہ کچھ حاصل کر لیتے تھے۔

جسے آج شاید سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

اس سلسلہ میں بزرگ بن شہریار نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض ایسی رعایتیں ان ممالک میں مسلمانوں کو حاصل تھیں جن سے خود اس ملک کے باشندے محروم تھے۔ اس نے لکھا ہے کہ:۔

ص۹

"ذہب[1] (سونے) والے ملک اور جاوہ کے بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی بھی ہو ایک خاص شکل ہی کے ساتھ بیٹھ سکتا ہے۔ اس نشست کا نام ان کی اصطلاح میں برسلا ہے چارہ زانو ہو کر لوگوں کو ان بادشاہوں کے سامنے بیٹھنا پڑتا ہے حتیٰ کہ خود ان کے ملک کے لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ خواہ وہ کسی درجے کا آدمی ہو۔ نشست کے اس خاص طریقہ کو ترک کر کے راجہ کے سامنے بیٹھنے کی اگر کوئی جرأت کرے تو سخت سزا کا مستوجب ہوتا ہے"

---

[1] بظاہر اس سے مراد ہندوستان ہی ہے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مسلمان ہندوستان کو "سونے کے گھر کا شعاعت" اور کبھی "خانہ زر" بھی کہتے تھے۔ بزرگ بن شہریار کے دوسرے بیانوں سے معلوم ہوتا تھا کہ کبھی کبھی اس لفظ کا اطلاق مالابار کے علاقہ پر کرتے تھے ممکن ہے کہ اس زمانہ میں سونا اس علاقہ سے نکلتا ہو۔ اب بھی ہندوستان میں سونے کی کانیں ریاست حیدرآباد میں اور ریاست میسور میں پائی جاتی ہیں۔ جاوہ کا لفظ ترجمہ میں میں نے لکھا ہے اصل کتاب میں "بلاد الزانج" ہے لیکن دوسرے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی تجار جاوہ کا لفظ زانج سے کرتے تھے۔ ۱۲

لیکن اسی کے ساتھ اسی کا بیان ہے کہ:۔

الی الیوم رسم ان	اس وقت تک یہ دستور چلا آرہا ہے کہ
یجلس المسلمون	ان غیر مسلم راجگان کے سامنے مسلمان
بین ایدیھم کما	جس طرح چاہیں بیٹھ سکتے ہیں لیکن مسلمانوں
یشاؤن ویجلس غیرھم	کے سوا دوسرے لوگ مذکورہ بالا قاعدہ
علی الرسم الاول	کے مطابق بیٹھنے پر مجبور ہیں جس کا نام
برسلا فان غیر	برسیلا ہے نشست کے اس خاص طریقے کے
جلسۃ کانت علیہ	خلاف راجہ کے سامنے اگر کوئی بیٹھنے کی جرأت
الغرامۃ (عجائب الہند ص۱۹۶)	کرے تو اسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

اور میرا خیال تو یہ ہے کہ اس عہد کے یہی مصنفین جنکی کتابوں سے اخذ کرکے میں ان معلومات کو پیش کر رہا ہوں اس زمانہ کے مسلمانوں کے عام اخلاقی معیار کی بہترین شہادتوں کا کام دے سکتے ہیں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ عموماً لوگوں کا عام حال یہ ہے کہ دوسری قوموں کا یا دوسروں کے اوطان واقالیم کا جب ذکر کرتے ہیں تو بہت کم انصاف سے کام لیتے ہیں۔ دیکھا یہی جاتا ہے کہ لوگ اپنے ملک پر مشکل ہی سے دوسرے ممالک کو ترجیح دیتے ہیں اور اسکی ایک وجہ بھی ہے۔ اصل واقعہ تو یہ ہے کہ اپنا ملک ہو یا دوسرے کا، اپنا دیس ہو یا پردیس۔ عجب سب ہی کا حال یہ ہے کہ جہاں بھی جو جلا یا جاتا ہے مرنے ہی کے لئے جلا یا جاتا ہے، یورپ ہو یا امریکہ ایشیا ہو یا افریقہ، ہند ہو یا سندھ، چین ہو یا جاپان، جہاں کہیں بھی زندگی کا بخار،

عناصر کے کسی خاص ریزے یا مادے کے کسی خاص ٹکڑے پر جڑھتا ہے تو ظاہر کر کر دم ہی لیکر اُترتا ہے ایسی زندگی جس کی ہر بہار کے پیچھے خزاں کے دھکے ہوں اور ہر شادی کے نقارے کے ساتھ غم کا نوحہ شروع ہو جاتا ہو ہر صحت کو مرض دھمکیاں دے رہا ہو۔ الغرض جہاں ہر بقا کا انجام فنا ہو وہاں یہ سوال کہ اس دنیا کا کونسا خطہ اچھا ہے اور کونسا بُرا۔ تھوڑی دیر کی غفلت کا ذریعہ تو بن سکتا ہے۔ لیکن حقیقت جب سامنے آتی ہے تو سوئٹزرلینڈ یا کشمیر کے مرغزاروں اور صحرائے افریقیہ کے واحستانوں[۱] میں سچ پوچھئے تو کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

تاہم آدمی جس خطہ میں پیدا ہو جاتا ہے یا پیدا کر دیا جاتا ہے۔ چاہتا ہے کہ جتنے دنوں بھی یہاں جلینا ہے کسی نہ کسی طرح ان دنوں میں اس علاقے کے ماحول کو جتنی اور سے اپنے اندرونی احساسات کے مطابق بنا لیا جائے ہیں تو سمجھتا ہوں کہ آدمی کی اسی نفسیاتی کارگیری کا نام حب الوطن وغیرہ ہے اور حب الوطن کے اس خود آفریدہ جذبہ کی تسکین کے لئے دوسرے ممالک اور اقالیم کے مقابلہ میں اپنے وطن کی ترجیح و تفضیل کے وجوہ تلاش کرتا رہتا ہے۔ پھر جیسا کہ اس دنیا کا کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس میں شر کا پہلو نہ پیدا ہوتا ہو یہی حال اس عالم کے شرور اور برائیوں کا بھی ہے۔ کہ غور کرنے کے بعد کسی نہ کسی حیثیت سے کچھ خیر کے پہلو بھی ان میں نکل ہی آتے ہیں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ شر کے پہلوؤں سے

---

[۱] ریگستانی صحراؤں کا قاعدہ ہے کہ کہیں کہیں بیچ میں ان کے نخلستان پیدا ہو جاتے ہیں عربی میں انکو "واحات" کہتے ہیں۔ میں نے اسی سے "واحستان" کا لفظ بنا لیا ہے ۱۲

قطع نظر کر کے خیر ہی کے پہلوؤں سے اپنے وطن کے متعلق آدمی تسلّی حاصل کیا کرتا ہے۔ اسی قسم کے مصنّفین میں جنکی کتابوں سے میں اپنی اس تصنیف میں کام لے رہا ہوں ایک مصنّف علاّمہ مقدسی بھی ہیں۔ اُن کی مشہور کتاب اس سلسلے میں "احسن التقاسیم" نامی ہے۔ ایک موقع پر بلوچستان و مکران کے مفازہ کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ یہ بڑا خطرناک مفازہ (ریگستانی ٹاپو یا بان) ہے بلوچی اور قفص قوم کے ڈاکو عموماً یہاں قافلوں پر چھاپے مارتے ہیں۔ آئندہ کسی موقعہ پر ان ظالموں کے مظالم کا شاید ذکر بھی آئے۔ اس وقت کہنا یہ ہے کہ مقدسی کی ملاقات اسی مفازہ کے خاص اس مقام پر جہاں ڈاکو جمع ہو کر قافلوں پر حملوں کی تیاریاں کیا کرتے تھے ایک شخص سے ہوئی جو صرف توت کے چند درخت اور انگور کی چند بیلوں کی پرورش میں وہاں مشغول تھا۔ مقدسی نے لکھا ہے کہ میں نے پوچھا کہ "کیا تمہارا دل یہاں نہیں گھبراتا؟" بوڑھا آدمی تھا۔ بولا کہ "چند سال ہوئے میں نیشاپور گیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ میرا قیام بھی وہاں رہا۔ لیکن لوگوں کی گھما گھمی، آمد و رفت، شل غپاڑے سے میرا دل اتنا پریشان ہوا کہ وحشت کے اس حال پر زیادہ دن تک صبر نہ کر سکا اور سکون کی زندگی گزارنے کیلئے میں پھر اسی ریگستانی گوشے میں پناہ گزین ہو گیا ہوں۔"

لیجئے! ایک ایسے وحشت کدہ میں بھی آدمی کا جب جی چاہتا ہے تو سکون و عافیت کا پہلو پیدا کر لیتا ہے۔

مسلمان سیاحوں کی بے تعصبی اور راست بیانی

بہرحال سچ پوچھیے تو اس جذبہ کا شعوری یا غیر شعوری تقاضہ ہوتا ہے جو عموماً اپنے ملک کے مقابلہ میں دوسرے ممالک کی خوبیوں کا اعتراف آدمی دل کھول کر نہیں کرتا لیکن اسلام کے ان مصنفین کی کتابوں کو پڑھکر میں تو حیران ہو کر رہ گیا کہ خلاف دستور انہوں نے انتہائی فیاضیوں سے کام لیتے ہوئے ایسے ممالک کی تعریفیں کی ہیں جن کے باشندوں سے نہ ان کا کوئی دینی تعلق تھا، نہ نسلی، اور تعلق کیا معنے؟ ان کے مذہب کی رو سے جہاں کے باشندے کافر اور بے دین تھے لیکن بایں ہمہ کوئی ملک ہو، اس کے باشندوں کا مذہب و دین کچھ ہی ہو کسی نسل کے لوگ ہوں جو بھلائیاں اس ملک میں ان کو نظر آئی ہیں بغیر کسی جنبہ داری اور عصبیت کے دل کھول کر ان کا اظہار ان مصنفین نے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعات کے اظہار کے سلسلہ میں ان کے قلم سے جہاں ایسی باتیں نکل گئی ہیں جنہیں ان ممالک کے نقائص و عیوب ہم قرار دے سکتے ہیں۔ ان کی واقعیت میں بھی شک و شبہ کی بہت کم گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

چونکہ اس وقت ہندوستان کا ذکر چھڑا ہوا ہے اسلیے جی چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں اسی کے متعلق بعض خاص چیزوں کا تذکرہ کروں۔

اس سلسلہ میں سب سے پرانی کتاب سلیمان تاجر کی سمجھی جاتی ہے یعنی دوسری صدی ہجری کے کل سنتیس۳۷ سال بعد کی یہ کتاب معلوم ہوتی ہے

عرض کر چکا ہوں کہ چوتھی صدی ہجری تک کے تجار اور سیاحوں کو اندرون ہند میں گھسنے کے مواقع بآسانی جب میسر نہیں آتے تھے تو دوسری اور تیسری صدی کے ابتدائی سالوں میں اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے مگر پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سیاحوں نے ہندوستان کے متعلق صحیح معلومات کا ذخیرہ کسی نہ کسی طرح جمع ہی کر لیا تھا اور زیادہ تر یہ معلومات ان کے مشاہدات ہی سے ماخوذ ہیں جس کا پتہ خود ان کے بیانات سے ملتا ہے مثلاً سلیمان تاجر ہندوستانی جوگیوں اور نفس کشی کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقعہ پر لکھتا ہے کہ:-

"بلادِ ہند میں رہتے جوگیوں کا ایک طبقہ پایا جاتا ہے یہ سیلانی لوگ ہوتے ہیں پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومتے رہتے ہیں انسانوں سے ان کا میل جول بہت کم ہوتا ہے عموماً یہ جنگل کی جڑی بوٹیاں یا جنگلی پھلوں کو کھا کر گذارہ کرتے ہیں اپنے تناسلی عضو میں لوہے کا ایک چھلا ڈال لیتے ہیں تا کہ عورتوں کے کام کے باقی نہ رہیں بعض ان میں بالکل ننگ دھڑنگ رہتے ہیں کچھ لوگ ان میں سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دھوپ میں ننگے کسی کپڑے کے بغیر کھڑے ہونے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی شیر کی کھال بدن پر ڈال لیتے ہیں۔"

الغرض اسی قسم کی باتوں کو بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ:-

فقد رأیت رجلا منھم جیسا کہ میں نے بیان کیا اسی قسم کے ایک آدمی کو

كما وصفت ثم انصرفت	میں نے خود دیکھا تھا پھر سولہ سال بعد
وعدت بعد ست عشرة سنة	جب میں واپس ہوا تو اس شخص کو پھر
فرأيته على تلك الحال۔	اسی حال پر میں نے پایا۔ مجھے حیرت ہوئی
فعجبت كيف لم تسل عينه	کہ اس کی آنکھ اس عرصے میں دھوپ کی
من حر الشمس (سلیمان ص۵۱)	حرارت سے بہ کیوں نہ گئی۔

جس سے معلوم ہوا کہ سلیمان خود ہندوستان آیا تھا اور یہ واقعہ اس کا چشم دید ہے اس نے خود دیکھا ہے، بلکہ اس فقرے سے تو اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آمد و رفت کا سلسلہ ان عربی تاجروں کا ملک ہند میں جاری تھا۔ سولہ سال کے بعد پھر وہ اس ملک میں واپس ہوا ہے اور بھی دوسرے مقامات پر اسی قسم کی باتیں اس نے لکھی ہیں یہ تو سب ہی بیان کرتے ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ ہندوستان میں کسی ایک راجہ کی حکومت قائم نہیں ہے۔ سلیمان کے الفاظ یہ ہیں کہ بل کل واحد ملك بلاده (سلیمان ص۵۱) بلکہ ہر راجہ اپنے علاقے کا حکمران ہے۔

صرف سواحل بحر ہند کے راجاؤں کی سلیمان نے ایک طویل فہرست دی ہے جس میں بعض الفاظ تو سمجھ میں آتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کے متعلق پتہ نہیں چلتا کہ اس کی مراد کیا ہے۔ بلہرا کا ذکر تو گذر ہی چکا ہے، سلیمان نے لکھا ہے کہ بلہرا کے علاقے کو کم کم کہتے ہیں شاید کوکن کی یہ خرابی ہو، لکھا ہے کہ:

وحوله ملوك كثيرة يقاتلونه	بلہرا کے پڑوس میں اس پاس میں بہت
(سلیمان ص۲۸)	سے راجہ ہیں جو اس سے جنگ کرتے رہتے ہیں

پھر ان ہی ملوک میں ملک الجرز کا نام لیتا ہے جس سے غالباً گجرات کا راجہ

مقصود ہے پھر ایک ملک الولاقی کا تذکرہ کیا ہے۔ واللہ اعلم اس سے کیا مراد ہے۔ دریائے تاپتی جس علاقے میں بہتا ہے یعنی خاندیس مقصود ہے یا کیا ہے اتنا پتہ دیا ہے کہ اس راجہ کے علاقہ کی عورتیں تمام ہندوستان کی عورتوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ حسین ہیں۔ پھر رُہمی نامی راجہ کا ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ رہمی اور ملک الجزر میں برابر جنگ ٹھنی رہتی ہے اور یہ کہ بلہراسے بھی رہمی کا مقابلہ ہوتا رہتا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ رہمی غالباً کاٹھیا واڑ کے خطہ کی تعبیر ہے۔ بہرحال کچھ ہی ہو۔ ان مورخین کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے اور یوں بھی دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان بے شمار حکومتوں اور ریاستوں کی شکل میں بٹا ہوا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان جو کچھ تھا آج اس کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔ جنوبی ہند کی تاریخ مولوی محمود خاں بنگلوری نے جو لکھی ہے اُس میں میسور کی ایک مستند تاریخ سے یہ نقل کیا ہے کہ :-

"جب میسور کے راجہ نے سرنگا پٹن کے بالمقابل کی تیرتھ کو جانا چاہا تو اُسکو راستے میں دو دوسرے راجاؤں سے اجازت لینی پڑی۔"

(بحوالہ تاریخ میسور ص۲۳ تاریخ جنوبی ہند ص۳۰)

اور اس راستہ کا فاصلہ کتنا تھا۔ مولوی محمود خاں کا بیان ہے :-

"میسور اور سرنگا پٹن گڑھ کا درمیانی فاصلہ کل سولہ میل کا ہے۔"

سمجھا آپ نے کل سولہ میل کے اندر اندر دو دو راجدھانیاں واقع تھیں۔ مجھے بتلانا یہ ہے کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان مسلمان سیاحوں کی نظر واقعات کی تحقیق میں کتنی گہری تھی۔

مسلمانوں میں اجنبی زبانوں کے سیکھنے کا ذوق و شوق

ان ہی سیاح مؤرخین کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں قریب کے نہیں بلکہ ہندوستان سے دور اندلس تک کے مسلمان ہندوستانی زبان سیکھتے تھے اور اس میں گفتگو کرتے تھے۔ بزرگ بن شہریار نے ابوالزہر البختا ناخدا کا جو پہلے ایک ایرانی مجوسی تھا، اور بعد کو مسلمان ہوگیا تھا اسی کی زبانی ایک بڑا طویل قصہ نقل کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ہمارا جہاز طوفان میں گھر گیا تھا۔ لوگ پریشان تھے۔ کپتان کی نگاہوں سے بچکر ایک اندلسی مسلمان جو قادس کا رہنے والا تھا جہاز میں سوار ہوگیا تھا اور چند دنوں جہاز کے ایک گوشہ میں پڑا رہا۔ لوگوں کی پریشانی دیکھکر باہر نکلا اور کپتان کے پاس پہنچا۔ بزرگ نے اس موقع پر لکھا ہے کہ:۔

سلم علیه بالهندیة ہندوستانی زبان میں اس اندلسی مسلمان نے کپتان کو سلام کیا۔ کپتان نے اسی فرد علیه زبان میں اس کو جواب دیا۔ (عجائب الہند ص۱۲۲)

اجنبی زبانوں کے سیکھنے کے اس شوق ہی کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ بزرگ ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آج سے ہزار سال پہلے ہندوستان کی کسی زبان میں قرآن کا ترجمہ بھی ہوچکا تھا۔ بزرگ بن شہریار نے ابو محمد الحسن بن عمرو بن حمویہ کے حوالہ سے ایک طویل روایت درج کی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک راجہ جو کشمیر اعلیٰ اور کشمیر اسفل کے درمیانی حصّہ کا راجہ تھا اور

مہروک بن رائق اُس کا نام تھا اس نے ۲۷۰ھ میں منصورہ کے امیر عبداللہ بن
عمر بن عبدالعزیز کے پاس خط لکھا کہ اس کے پاس ایک ایسا آدمی بھیجدیا جائے۔

یفسر له شریعۃ الاسلام جو شریعتِ اسلام کے احکام ہندی

بالہندیہ زبان میں بیان کر سکے۔

منصورہ کے امیر نے ایک مسلمان کو بھیجا جسکے متعلق لکھا ہے کہ:-

عرف لغاتھم علی اختلافہا ہندوستان کی مختلف زبانوں کو جانتا تھا

راجہ کے پاس یہی مسلمان چند سال رہا اور اسلام سے راجہ کو پورے طور
پر اس نے واقف بنادیا۔ اسی سلسلہ میں اس کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ:-

انه ساله ان یفسر له القرآن راجہ نے اس سے خواہش کی کہ ہندی

بالہندیۃ ففسرته له (عجائب الہند ص۳) زبان میں اس کیلئے قرآن کی تفسیر کرے

اسی کا بیان ہے کہ انتہیت من التفسیر الی سورۃ یٰسین (یعنی
سورۂ یٰسین تک قرآن کی تفسیر ہندی زبان میں اُسنے پوری کردی تھی) اگر یہ واقعہ
صحیح ہے تو شاید قرآنی ترجمہ کے متعلق اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ترجمہ کا سب سے پہلا فخر
سرزمین ہند کی کسی زبان کو حاصل ہوا تو اس کا مشکل ہی سے انکار کیا جاسکتا ہے غالباً
اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسری تیسری صدی کے ان سیاحوں کی کتابوں میں جو عربی
زبان میں لکھی گئی ہیں ہندی زبان کے الفاظ کا ایک ذخیرہ پایا جاتا ہے گو خالص
ہندی شکل میں وہ الفاظ باقی نہیں رہے ہیں۔ مثلاً تلا کو تلاج، ڈنگی یعنی کشتی
کو دونیج، ناگ کو ناغراں، ہنڈول کو ہندول، پلنگ کو بلنج، وغیرہ وغیرہ بیسیوں
الفاظ ان کتابوں میں ملتے ہیں۔

جانوروں کی بولی کا علم

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان مسلمان مورخین نے ہندوستان اور ہندوستان کے باشندوں کے متعلق جو باتیں بیان کی ہیں اُن سے پُرانے مسلمانوں کی وسعتِ قلبی کا عجیب ثبوت ملتا ہے۔ اگر حسن ظن سے کام نہ لیا جائے تو اسے ان مسلمانوں کی شاید خوش اعتقادی سمجھی جا سکتی ہے، ایک واقعہ نہیں متعدد واقعات ان ہی کتابوں میں ایسے منقول ہیں جنکو پڑھکر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً بزرگ بن شہریار نے بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں بکثرت ایسے اہلِ کمال پائے جاتے ہیں جو علم زجر میں کمال رکھتے ہیں۔ یہاں پر علم زجر سے کیا مراد ہے، آئندہ جس واقعہ کو اس کے بعد بیان کیا ہے اس سے تو میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ جانوروں کی بولیوں کا علم خیال کیا جاتا تھا کہ ہندوستان والوں کو حاصل ہے کیونکہ آگے قصہ یہ بیان کیا ہے کہ :-

"سیراف (اس ایرانی بندرگاہ کا ذکر آئندہ مختلف مقامات پر آئیگا اُس زمانہ کی یہ سب سے بڑی تجارتی بندرگاہ تھی) بہرحال اسی سیراف کے ایک تاجر نے بیان کیا کہ صابور نامی مقام سے وہ نوبارہ براہِ خشکی جا رہا تھا۔ وہاں کے مقامی راجہ سے تاجر نے درخواست کی کہ اُسکے ساتھ بطورِ بدرقہ کے حفاظت کا سامان کر دیا جاوے۔ راجہ نے ایک آدمی اُس تاجر کے ساتھ کر دیا۔ جو راجہ کے دربار کے پائک (پیادوں) میں تھا

تاجر کہتا ہے کہ ہم اور وہ دونوں جب روانہ ہوئے او صیمور
سے باہر نکل آئے تو ایک تلاج (تالاؤ) کے کنارے بیٹھے یعنی
پانی کا تالاب تھا اور ایک گرام یعنی باغ بھی وہیں پر تھا۔
مطلب یہ تھا کہ کچھ کھا پی لیں۔ ہمارے ساتھ کھانے میں
کچھ چاول بھی تھے۔ اتنے میں ایک کوے کی آواز آئی۔ اس
پر میرے ہندی رفیق نے کہا کہ جانتے ہو یہ کوا کیا کہہ رہا ہے؟
میں نے کہا کہ نہیں۔ ہندی رفیق نے کہا کہ کوا کہہ رہا ہے کہ جن
چاولوں کو تم لوگوں نے کھایا ہے اس میں میرا بھی کچھ حصہ تھا
اور میں اس کو ضرور کھا کر رہوں گا۔

سیرافی تاجر کا بیان ہے کہ ہندی کے اس بیان پر مجھے
تعجب ہوا کیونکہ ہم لوگ تو اس چاول کو کھا چکے تھے کچھ بھی
باقی نہ چھوڑا تھا۔ آخر ہم وہاں سے آگے روانہ ہوئے چلے
جا رہے تھے ابھی دو فرسخ بھی راستہ طے نہ ہوئی ہو گی کہ اچانک
ہمارے سامنے پانچ ہندوستانی آدمی آتے دکھائی دیئے یا شاید
کچھ تھے ان لوگوں کو دیکھ کر میرا جو ہندی رفیق تھا میں نے دیکھا
کہ وہ پریشان ہو رہا ہے اور اضطراب کی حالت میں ہے اور
مجھ سے کہنے لگا کہ ان لوگوں سے میں لڑوں گا۔ میں نے کہا کیوں؟
اس نے کہا کہ مجھ میں اور ان لوگوں میں پرانی دشمنی ہے ہم یہ گفتگو
کر ہی رہے تھے کہ ان آنے والوں نے خنجر کھینچ لیے اور بیچارے

میرے رفیق پر پل پڑے حتیٰ کہ اسے جان ہی سے مار ڈالا اور اس کے
پیٹ کو پھاڑ دیا۔ ان کی اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس بیچارے کے
پیٹ میں جو کچھ تھا سب باہر نکل آیا۔ اس حال کو دیکھ کر میرے تو ہوش
جاتے رہے۔ کچھ ایسا بدحواس ہوا کہ چلنے کی سکت مجھ میں باقی نہ رہی
بیہوش ہو کر گویا میں گر پڑا۔ میری عقل بجا نہ تھی لیکن ان قاتلوں نے
مجھے تسلی دی اور سمجھایا کہ تم مت ڈرو کیونکہ ہماری دشمنی تو اس شخص سے
تھی تم سے ہمارا کیا تعلق؟ یہ کہہ کر جس راہ سے آئے تھے اسی پر واپس
چلے گئے جب کچھ دور نکل گئے تب میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہیں کوا
اترا اور مقتول رفیق کے شکم سے جو چاول باہر نکل پڑے تھے انہیں
چن چن کر کھا رہا ہے۔" (بزرگ بن شہریار ص ۱۵۱)

اسی بزرگ بن شہریار نے موسیٰ صندا پوری کے حوالے سے تقریباً اسی قسم کی ایک اور روایت نقل کی ہے کہ:-

"میں صندا پور کے راجہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا دیکھا کہ راجہ کچھ ہنس رہا ہے۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا میرے ہنسنے کی وجہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم؟ راجہ نے کہا کہ دیکھو وہ سامنے دیوار پر گرگٹ بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ مجھ سے کہہ رہی ہے۔ ایک پردیسی مسافر تمہارے پاس آ رہا ہے۔ راجہ کی اس حماقت پر مجھے تعجب ہوا اور میں نے اسی وقت چاہا کہ اس کے پاس سے اٹھ جاؤں، لیکن اس نے اصرار کیا کہ بیٹھے رہو اور جب بات تم سے کہی گئی ہے اس کے نتیجہ کو بھی

تو دیکھ لو اُس کے اس کہنے پر بیٹھا رہا۔ ہم گفتگو میں مشغول ہی تھے کہ اچانک راجہ کے آدمیوں میں سے ایک آدمی آیا اور اطلاع دی کہ صندا پور کی خلیج میں عمان کا ایک جہاز ابھی پہنچا ہے اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک جماعت تاجروں کی کپڑے اور عرق گلاب وغیرہ لیئے ہوئے آرہی ہے۔"

(بزرگ بن شہریار صـ ۱۵۸)

فصلِ خصومات کا حیرت انگیز طریق

اور اس سے بھی دلچسپ تر بیان سلیمان تاجر کا ہے یعنی ہندوستانی عدل و انصاف کی تعریف کرتے ہوئے اس نے اپنا ذاتی تجربہ یہ بیان کیا ہے کہ :-

" ہندوستان میں کسی ایسی بات کا کسی پر دعویٰ اگر کوئی کرتا ہے جسکے ثابت ہو جانے کے بعد مدعا علیہ کا قتل ہو جاتا وہاں کے قانون کی رو سے ضروری ہو تو مدعی سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا آگ والے امتحان میں اس کو ڈالنا تم پسند کرتے ہو؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ ہاں! تب لوہے کے کسی ٹکڑے کو آگ میں خوب گرم کرتے ہیں۔ جب وہ بالکل لال ہو کر خود آگ کا ایک انگارہ بن جاتا ہے تب مدعی علیہ سے کہا جاتا ہے کہ ہاتھ آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ پر ایک خاص قسم کے درخت کے سات پتے رکھ دیے جاتے ہیں اور پھر اسکے ہاتھ پر اسی گرم گرم

دہکتے ہوئے لوہے کو رکھدیا جاتا ہے۔ یعنی درمیان میں صرف وہی چند پتے رہتے ہیں۔ پھر اس گرم لوہے کو ہاتھ پر رکھے ہوئے وہ آگے پیچھے دوڑتا ہے۔ اس کے بعد اسکے ہاتھ پر ایک تھیلی چڑھادی جاتی ہے اور راجہ اس پر اپنی مہر ثبت کرتا ہے پھر تین دن جب گذر جاتے ہیں تو تھیلی سے ہاتھ نکالا جاتا ہے اور ایسے چاول جن کے چھلکے ان سے الگ نہیں کئے گئے ہوں یعنی دھان اسکے حوالے کئے جاتے ہیں کہ ان کے چھلکوں کو اپنے ناخن سے اتارے۔ اگر لوہے کی آگ سے اس کا ہاتھ متاثر نہیں ہوتا تو باآسانی چھلکوں کو اُتار دیتا ہے اور لوہے قتل سے وہ بچ جاتا ہے۔ اور بجائے اُسکے خود مدعی پر جرمانہ عاید کیا جاتا ہے یعنی ایک من سونا ادا کرے جس پر راجہ خود قبضہ کرلیتا ہے۔ بسا اوقات بجائے اس ترکیب کے ہانڈی میں پانی گرم کرتے ہیں۔ خواہ لوہے کی ہانڈی ہو یا تانبے کی پانی کو اتنا گرم کرتے ہیں کہ آدمی اُس کے قریب جانیکی بھی ہمت نہیں کرسکتا۔ پھر اسی گرم پانی میں لوہے کی ایک انگوٹھی ڈال دیجاتی ہے۔ اور مدعیٰ علیہ سے کہا جاتا ہے کہ اسی کھولتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال کر اس انگوٹھی کو نکال لے۔" (سلیمان ص۴۹)

اس قصّے کو بیان کرنے کے بعد سلیمان نے آخر میں لکھا ہے:۔

وقد رئیت من ... میں نے اپنی آنکھ سے اُس آدمی کو دیکھا ہے۔

ادخل یدہ و اخرجہا صحیحۃ (سلیمان ص۲۹) جس نے اس کھولتے پانی میں ہاتھ ڈالا اور بالکل درست حال میں اپنے ہاتھ کو پانی سے باہر نکال لیا۔

اس سے بحث نہیں ہے کہ فصلِ خصومات کا یہ ہندی طریقہ واقعۃً کسی حد تک قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ہاتھ ڈالنے والے کن تدبیروں سے کام لیتے تھے یا کیا کرتے تھے ہیں تو صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ ان مسلمان سیاحوں کے بیانات کا ایک بڑا حصہ دیدہ اور چشم دید شہادتوں کا نتیجہ ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سلیمان مدعی ہے کہ مجرموں کے ساتھ اس طرزِ عمل کو اختیار کرتے ہوئے اس نے خود دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک پردیسی اجنبی آدمی کیلئے یہ مشکل ہے کہ اندرونی حقائق سے وہ صحیح واقفیت حاصل کرے۔ بہ ظاہر جو بات اس کے سامنے گذری اسی کا اس نے اظہار کر دیا ہے۔ اور یہ انصاف پسندی کے جذبہ کا کتنا اچھا معصوم ثبوت ہے۔ چاہتا تو بیسیوں شکوک کا اظہار کر سکتا تھا خصوصاً مسلمانوں کے عام ائمہ کا خیال بھی جب یہ ہے کہ اس قسم کے طریقوں سے دعاوی کا فیصلہ صحیح نہیں ہے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو قرعہ اندازی کے ذریعہ سے بھی فصلِ خصومات کے طریقہ کا انکار کرتے تھے یا مباہلہ تک کے متعلق مشہور ہے کہ احقاقِ حق یا ابطالِ باطل کا ذریعہ عام لوگوں کے لئے اس کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ انبیاء یا خدا کے خاص بندوں کی اور بات ہے۔

ہندوستانی رسم ورواج

خیر یہ دوسری باتیں ہیں۔ ان خود اعترافی شہادتوں کے سوا جو معلومات ان مؤرخین کی کتابوں میں ملتے ہیں ان کی صحت کی ایک دلیل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ گو انہوں نے آج سے ہزار برس پہلے کی باتیں ہندوستان کے متعلق بیان کی ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی بہت سی بیان کردہ ایسی باتیں اب بھی ہندوستان میں پائی جاتی ہیں جن سے ان کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً سلیمان ہی نے بیان کیا ہے کہ ہندوستان کے لوگ دن کے کھانے سے پہلے غسل ضرور کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کی عام عادت یہ ہے کہ مسواک کئے بغیر کھانا نہیں کھاتے۔ وہ ایام کے دنوں میں عورتوں سے مقاربت جائز نہیں سمجھتے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جیسا اس ملک میں حکمرانی چند خاص خاندانوں کے ساتھ مخصوص ہے اسی طرح ہر ہر پیشہ بھی خاص خاص خاندانوں کے لئے موروثی طور پر مختص ہے، حتیٰ کہ طبابت کتابت اس قسم کی چیزیں بھی خاندانی ہیں۔ ان گھرانوں کے سوا جن کا یہ موروثی پیشہ ہے کوئی دوسرا اس پیشہ کو اختیار نہیں کرسکتا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان والے عموماً اپنے مُردوں کو آگ میں جلاتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ یہ باتیں اس زمانہ تک ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔ (سلیمان ص ۵۰ تا ۵۵)

اور عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے متعلق حالانکہ ان ہی لوگوں کا بیان ہے کہ روزانہ غسل کے بغیر وہ کھانا بھی نہیں کھاتے۔ لیکن پیشاب کے

سلسلہ میں لکھا ہے کہ:۔

"پیشاب کرنے کے بعد بغیر اس کے کہ نجاست صاف کریں فوراً کپڑے کو برابر کر لیتے ہیں" (سلیمان صہ ۱۱۹)

عربوں کو ہندوستانیوں کی اس عادت پر تعجب ہوا ہے۔

اسی سلسلہ میں اسنے ایک عجیب بات یہ بیان کی ہے میں بجنسہٖ سلیمان کے الفاظ نقل کرتا ہوں یعنی لکھا ہے کہ:۔

اهل الهند یطولون لحاهم ہندوستان والے لمبی لمبی ڈاڑھیاں رکھتے ہیں

اور صرف اسی قدر نہیں۔ آگے لکھتا ہے اور اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے کہ:۔

وربما رئیت لحیۃ احدهم بعض اوقات میں نے تین تین ہاتھ ثلاثۃ اذرع (سلیمان صہ ۵۵) لمبی ڈاڑھی والوں کو بھی دیکھا ہے۔

اسی کے ساتھ گو اس نے یہ بھی بیان کیا ہے :۔ کہ

"ہندوستان کے باشندوں کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جب انکا کوئی آدمی مر جاتا ہے اُس وقت وہ اپنے سر اور ڈاڑھی کے بال مُنڈوا دیتے ہیں"۔ (سلیمان صہ ۵۵)

ظاہر ہے کہ یہ رسم ہندوستان میں اب بھی جاری ہے لیکن علاوہ اس رسم کے عام طور پر ہندوستانیوں کا ڈاڑھی رکھنا اور اتنی لمبی لمبی ڈاڑھیاں کہ تین تین ہاتھ تک دراز ہو جائیں۔ بالکل عجیب ہے۔ آج تو شمالی ہند ہو یا جنوبی کسی علاقے میں ڈاڑھیوں کے رکھنے کا دستور نہیں ہے سکھوں میں اس کا رواج اگر ہوا بھی ہے تو یہ بالکل پچھلے زمانے کی بات ہے۔ ابن شہر

نہیں کہ بعض مذہبی لوگ ہندوؤں میں اب بھی ڈاڑھی رکھتے ہیں لیکن سلیمان
تو اس کو اس ملک کا عام رواج قرار دیتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستانی
چہروں سے ڈاڑھی کا غائب ہونا اس ملک کا نیا حادثہ اسی قسم کا ہو جیسے
آج مسلمانوں کے لئے بھی یہ ایک نئی افتاد ہے۔

یا ممکن ہے کہ المسعودی وغیرہ نے اپنی کتابوں میں جیسے ہندی معاشرت کی
ایک خاص خصوصیت کا ذکر کیا ہے لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں اب شاید
اس مسئلہ کو اتنی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔

ان لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں میں ڈکار یا کھانسی
کو بادِ مخالف کے اظہار سے زیادہ برا قرار دیا ہے۔ المسعودی نے بڑی تفصیل کے
اس ہندی رواج پر بحث کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ:۔

"ہندی حکماء کا خیال ہے کہ بادِ شکم کو پیٹ میں روک کے رکھنا
سخت موذی حرکت ہے۔ اور اس کا ارسال و اطلاق راحت بخش ہو کر
بیماریوں کا بہت بڑا علاج ہے۔ قولنج والوں کو اس سے بڑی
راحت میسر آتی ہے۔ اسی طرح مطحول یعنی جس کی تلی بڑھ گئی ہو
اس کے لئے اس کا روکنا سخت مضر ہے۔"

الغرض اسی قسم کی باتوں کے بعد لکھا ہے کہ:۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان والے خرطے (یا ہوا خارج ہونا) میں
کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے اور الضرط (یعنی مخفی آواز)
کو بھی کبھی نہیں روکتے۔ ان کے نزدیک کھانسی کی آواز

ضراط سے زیادہ اور ڈکار فساء سے زیادہ معیوب ہے۔ ان کا یہ خیال بھی ہے کہ ضراط کی آواز بدبو کے ازالہ کا ذریعہ ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہوا تو پیٹ میں ایک ہی ہوتی ہے البتہ اس کے نام مخارج کے اختلاف کی وجہ سے بدل گئے ہیں۔ صعودی حرکت جب ہوتی ہے تو اس کا نام لوگوں نے ڈکار رکھ دیا ہے اور ہبوطی کا نام فساء ہے۔ ورنہ دونوں ہواؤں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔[1] (مروج الذہب مسعودی ص ۲۵۳)

المسعودی نے اس سلسلہ میں بڑی تفصیلات سے کام لیا ہے خصوصیت کے ساتھ راجگانِ ہند کی عام عادت یہ بتاتا ہے کہ۔

لا یحتشمون	بادِ مخالف کے اظہار میں کسی قسم کی جھجک
فی اظہارھا	محسوس نہیں کرتے خواہ کسی حال میں صادر
فی سائر احوالھم	ہو یعنی خلوت ہو یا جلوت، تنہائی میں ہوں
وکذلک سائر حکمائھم	یا کبری مجلسوں میں۔ اس ملک کے راجہ
(ایضاً ص ۲۵۲)	اور یہاں کے حکماء یعنی پنڈتوں میں یہ عادت عام ہے

---

[1] آخر میں المسعودی نے اس ہندی رواج کو بہت سراہا ہے اور لکھا ہے کہ اسکے فوائد اور اسکی خلاف ورزی کے نقصانات کو ہر صاحبِ تمیز خود سمجھ سکتا ہے۔ اسکی رائے ہے کہ اربابِ مذاہب و ادیان نے شاید اسکی برائی بیان کی اور اسی لیے لوگ اس کو کچھ معیوب خیال کرنے لگے۔ اس نے ہندی حکمت کے حوالے سے بعض عربی اشعار بھی اس سلسلے میں نقل کیے ہیں ۱۲

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی درباروں یا علمی مجلسوں کیلئے بھی یہ کوئی معیوب بات ان سیاحوں کے زمانہ میں نہ تھی لیکن ظاہر ہے کہ اب یہ کیفیت باقی نہیں رہی ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ یہی حال ڈاڑھی کا بھی ہوا ہو۔

شراب سے پرہیز

سلیمان نے ہندوستان والوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"چین کے باشندوں کو کھیل تماشوں کا خاص ذوق ہے لیکن ہندوستان والے ان باتوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے نیز ہندوالے شراب بھی نہیں پیتے بلکہ اس وجہ سے سرکہ چونکہ شراب ہی سے بنتا ہے اس لئے سرکہ بھی استعمال نہیں کرتے"

اس نے اس کے بعد یہ عجیب تحقیقی بات لکھی ہے کہ:۔

"شراب نوشی سے پرہیز ہندوستان والے اس لئے نہیں کرتے کہ یہ کوئی ان کے مذہب کی بات[1] ہے بلکہ اس سے اُن کے دلوں میں نفرت اور ایک قسم کی گھِن پیدا ہو گئی ہے"

---

[1] اور یہ اس نے بالکل صحیح بات لکھی ہے کیونکہ وید تک میں بکثرت تذکرہ کیا گیا ہے کہ سوما کا رس اس ملک کے عوام ہی نہیں بلکہ یہاں کے رشیوں منیوں حتیٰ کہ دیوتاؤں تک کا ایک محبوب مشروبہ تھا اور سوما کے متعلق لکھا ہے کہ شدید قسم کی نشہ آور کوئی بوٹی تھی۔ جس سے رس بڑے اہتمام سے نکالا جاتا تھا۔ وید کے اشلوکوں کا ایک بڑا حصہ سوما کی تعریف ہی کے لئے مختص ہے ۱۲

پھر اسکی ایک لطیف توجیہ اُس نے خود کی ہے جس کا حاصل وہی ہے کہ ہندوستان چونکہ بیسیوں حکومتوں کی شکل میں بٹا ہوا ہے ہر راجہ دوسرے راجہ کی طرف سے ہمیشہ خطروں میں گھرا رہتا ہے۔ ہر وقت اپنے گرد و پیش کے راجواڑوں سے انہیں جنگ کرنی پڑتی ہے ان کا خیال ہے کہ:۔

"شراب پینے والے حکمران اپنی حکومت کی حفاظت نہیں کر سکتے اور نہ سلطنت کے انتظامات کو درست رکھ سکتے ہیں۔"

اُس نے لکھا ہے کہ:۔

"اسی لئے ہندوستان میں مشہور ہے کہ شراب پینے والا راجہ راجہ ہی نہیں ہے۔" (سلیمان صـ۵۲)

لیکن ابن حوقل ساحلی علاقوں کی نسبت بیان کرتا ہے کہ:۔

ان شہروں میں ناریل کے درخت بھی ہیں۔ اسی ناریل سے سرکہ اور شراب بناتے ہیں جس سے نشہ بھی پیدا ہوتا ہے اور المزر[1] بھی یہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو مصر والوں کا نبیذ ہے۔" ابن حوقل ۱۳۱

چوری کی سزا

سلیمان نے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں رہزنوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔" اسی طرح چور خواہ ایک ہی پیسہ کا چور کیوں نہ ہو اُس کو سخت سزا دی جاتی

[1] یہ شراب کی ایک قسم تھی بعض کہتے ہیں کہ شہد کو پانی میں ملا کر بناتے تھے۔ اور بعضوں نے لکھا ہے کہ جوار سے یہ شراب بنتی ہے ۱۲

ہے[۱] جس کی انتہا موت پر ہوتی ہے۔ چوروں کی سزا کا طریقہ یہ لکھا ہے کہ:۔

"ایک بڑی لمبی لکڑی ہوتی ہے۔ جس کے دونوں کناروں کو تیز کر کے اُس میں دھار پیدا کر دیتے ہیں اور چور کو اسی پر بٹھا دیا جاتا ہے اور اس طور پر بٹھایا جاتا ہے کہ لکڑی اس کے جسم میں گھس جاتی ہے اور حلق تک پہونچ جاتی ہے" (سلسلۃ ص ۵۵)

شادی کا طریقہ اور تعدد ازدواج کی اجازت

اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ:۔

"ہندوستان اور چین میں حرم کا دستور تو نہیں ہے لیکن نکاح ان دونوں ملکوں میں مرد جتنی عورتوں سے بھی چاہے کر سکتا ہے۔ شادی کا طریقہ یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکے والے بیاہ سے پہلے آپس میں تحفوں اور ہدیوں کا تبادلہ کرتے ہیں اور شادی کو ڈھول اور سنکھ کی آواز سے بستی میں مشہور کرتے ہیں۔ یہ تحفے اور ہدیے ہر شخص اپنی اپنی بضاعت کے مطابق دیتا ہے" (ص ۵۶)

بدکاری کی سزا

اس کے بعد اس کا بیان ہے کہ:۔

---

[۱] مہابھارت کے بعض اشلوکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چوری کی سزا قطع ید (یعنی ہاتھ کاٹنا) بھی اس ملک میں مروج تھی ۱۲

"کسی کی بیوی کے پاس اگر کوئی آئے اور اسکے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کرے تو قاعدہ ہے کہ اس قسم کے زانی آدمی کو ہندوستان کی تمام حکومتوں میں قتل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح جبراً کسی عورت سے اگر کوئی بدکاری کرتا ہے تو صرف مرد قتل کیا جاتا ہے اور عورت کی رضامندی سے اگر فعل کا وقوع ہوا ہو تو دونوں مار ڈالے جاتے ہیں۔"

عدالتی نظام

سلیمان نے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"ہندوستان میں بھی اور چین میں بھی فصل خصومات کے لئے قاضیوں (ججوں) کی الگ جماعت ہے۔ حکومت کے دوسرے عمّال اور ملازمین سے اس کام کا تعلق نہیں ہے۔"

(سلیمان ص ۵۵)

رفاہِ عام کے کاموں کا رواج

اسی نے یہ بیان کرنے کے بعد کہ:۔

"ہند کے باشندوں میں ایسی بہت سی دینی نیکیوں کا رواج ہے جن کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ خدا اُن کے کرنے والوں سے خوش ہوتا ہے۔ اور اپنا قرب و نزدیکی عطا کرتا ہے۔"

لکھا ہے کہ:۔

"مثلاً ان میں اس کا رواج ہے کہ مسافروں کے لئے سرائیں
بنواتے ہیں۔ اُن سرائوں میں بقال اور بنیے رہتے ہیں جن
سے راہ گیر ضرورت کی چیزیں خریدتے ہیں" (سلیمان ص ۲۸)

سیلون کی ایک عجیب رسم

اسی سلسلہ میں اس نے سیلون جسے عرب کے سیاح ہندی جزیرہ کے نام سے موسوم کرتے تھے اور اپنی کتابوں میں بکثرت اس کا تذکرہ سیلان یا سرندیپ کے نام سے انہوں نے کیا ہے۔ اسی جزیرہ کے متعلق اس عجیب وغریب رواج کا تذکرہ کیا ہے:

سرانديپ کے علاقے کا یہ دستور ہے کہ اس ملک کا راجہ جب
مرتا ہے تو ایک گاڑی جو زمین سے قریب ملی رہتی ہے
(یعنی پہیے اسکے چھوٹے ہوتے ہیں) اسی گاڑی پر راجہ کو لٹا
دیتے ہیں اور اسکے سر کو گاڑی کے تختہ کے کنارے اس طرح
رکھتے ہیں کہ اس کے بال زمین پر لٹکتے رہیں۔ اسی طرح گاڑی
کو کھینچتے ہوئے اس کا گشت کراتے ہیں۔ راجہ کے سر کے بال کو
گاڑی کے ساتھ زمین پر گھسیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں، ایک
عورت ہاتھ میں جھاڑو لیے گاڑی کے پیچھے پیچھے رہتی ہے اور خاک
دھول کو راجہ کے سر کے بالوں سے صاف کرتی جاتی ہے۔"

اصل چیز اس کے بعد جو اس نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ:۔

"اسی گاڑی کے ساتھ ساتھ ایک اور آدمی ہوتا ہے جو مسلسل پکارتا جاتا ہے کہ لوگو! دیکھو! یہ ہے وہ شخص جو کل تک تمہارا راجا اور حکمران تھا۔ تم ہی کل تک اس کے احکام اور فرامین نافذ ہو رہے تھے لیکن آج اسی کو دیکھو کہ اس کا انجام کیا ہوا! اس نے دنیا چھوڑ دی۔ موت کا فرشتہ اس کی جان نکال کرلے گیا۔ تو تم کو بھی چاہیئے کہ دنیا کی زندگی کے فریب میں نہ آجائیو اور بھی اسی قسم کی باتیں کہتا جاتا ہے۔ یہ تصہ تین دن تک جاری رہتا ہے۔ تیسرے دن پھر صندل، کافور، زعفران مہیا کئے جاتے ہیں اور ان ہی چیزوں کے ساتھ راجہ کو آگ میں پھونک دیتے ہیں اور اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیتے ہیں۔ (سلیمان ص۵۰)

ہندوستانیوں اور چینیوں کا تقابل

علاوہ ان رسوم اور عادات کے سلیمان نے ہندو والوں کے علم و فضل اور صنعت و حرفت میں جس قسم کی مہارت اور چابک دستیوں کے وہ مالک تھے ان باتوں کی دل کھول کر اُس نے بڑی تعریفیں کی ہیں بلکہ بعض امور میں ہندوستانیوں کو چینیوں پر فضیلت بھی دی ہے خصوصاً مذہب اور دین کے معاملہ میں لکھا ہے کہ:۔

"اس کا علم چین والوں کے پاس نہیں ہے۔ ان کا دین ہندوستان والوں ہی سے حاصل کیا ہوا ہے۔"

ہزار سال پہلے

اس نے لکھا ہے کہ :۔

"چینی خود کہتے ہیں کہ ہمارے البدودہ[1] کو ہندوستانیوں نے بنایا ہے"

پھر دونوں ملکوں کے مشترک مذہبی عقاید کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتا ہے کہ :۔

"ہندوستان میں طب کے ماہرین اور فلاسفر بھی پائے جاتے ہیں"

اور یہ کہتے ہوئے کہ طب اور نجوم کا چرچا گو چین میں بھی ہے لیکن :۔

ذالک بالھند	ان دونوں علوم (طب و نجوم) کا
اکثر	ہندوستان میں زیادہ رواج ہے

المسعودی نے بھی لکھا ہے کہ :۔

للھند التقدم فی صناعۃ	علم طب میں ہندوستان کے باشندے
الطب ولھم اللطافۃ	بہت آگے ہیں۔ اس فن میں دقت
والحذق (جلد اول ص۱۵۲)	نظری اور خذاقت ان کو حاصل ہے۔

ہندوستان کی پارچہ بافی

صنعتی مہارتوں کا ذکر کرتے ہوئے جو باتیں ان لوگوں نے بیان کی ہیں

---

[1] بظاہر البدودہ کا لفظ بدھ کے لفظ کی جمع معلوم ہوتی ہے۔ خدا جانے اس سے وہ مورتیاں مراد ہیں جو ہندوستان سے چین میں منتقل ہوئیں یا البددہ بدھ مذہب کی کتابوں کو بھی کہتے تھے ۱۲

سننے والوں کو آج بھی سن کر ان پر تعجب ہوتا ہے۔ مثلاً رہمی کے نام سے جس علاقے کو ان لوگوں نے موسوم کیا ہے، پارچہ بافی میں اس ملک کے کاریگروں کو جو مہارت حاصل تھی اسکے متعلق سلیمان لکھتا ہے:۔

"رہمی کا ملک کپڑوں کا ملک ہے ایسے کپڑے اس ملک میں تیار ہوتے ہیں جن کی مثال کہیں نہیں پائی جاتی۔"

اور اس کے متعلق اپنی چشم دید شہادت اس نے دالکی ہے یعنی لکھا ہے کہ:۔

"حسن و باریکی میں ان کپڑوں کی حالت یہ ہے کہ ایک انگوٹھی میں پورا تھان سما جاتا ہے۔ یہ سوتی کپڑا ہے میں نے خود اسکو دیکھا ہے۔" (سلیمان ص۳۰)

ودیالوں کا رواج

سلیمان نے ہندوستان کے ودیالوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ سرندیپ کے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ:۔

"اس ملک کے باشندوں کے پاس بھی ایک خاص شریعت ہے اور ان میں اس شریعت کے علماء پائے جاتے ہیں۔ ان کے بھی حلقے ہوتے ہیں جیسے ہمارے یہاں محدثین کے حلقے ہیں ہند کے لوگ ان علماء کے ارد گرد اکٹھے ہوتے ہیں۔ اور اپنے پیغمبروں کی سیرت اور اپنے دین کے مسائل ان سے سن سن کر لکھتے ہیں۔" (سلیمان ص۱۲۲)

میں کہاں تک بیان کروں حاصل یہ ہے کہ بغیر کسی جنبہ داری اعلا ادنیٰ درجہ کی عصبیت کے کسی دوسرے مذہب اور ملک کے متعلق کوئی جو کچھ بھی بیان کر سکتا ہے مسلمانوں کے ان مؤرخین اور سیاحوں نے اس کے بیان کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے محض اس لئے کہ اس ملک یا قوم کا مذہب چونکہ ہمارے مذہب اور اس کے اصول سے مختلف ہے یا میرے ملک اور میری قوم سے ان کا تعلق نہیں ہے محض اس لئے ان کی خوبیوں کے اعتراف کرنے میں انہوں نے قطعاً بخل یا تنگدلی سے کام نہیں لیا ہے۔ قدیم تو قدیم اس زمانہ میں بھی جب بلند نظریوں اور انصاف پسندیوں کے دعووں سے یورپ نے آسمانوں کو سر پر اٹھا لیا ہے اتنی بے لوثی کی نظیر کسی مصنف کے کلام میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ آپ اسے چاہیے وسعت مشرقی کہئے یا دوسری قوموں کے ساتھ انصاف کا جذبہ کہ المسعودی نے ہندوستان کے سمنیہ فرقہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی اصنام پرستی کے متعلق اپنی رواداری کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ:-

اہلِ ہند کی اصنام پرستی

"جیسے اسلام سے پہلے قریش بت پرستی کرتے تھے بت پرستی میں یہی حال ان کا بھی ہے۔ ان مورتیوں کو یہ پوجتے ہیں اور دعاؤں کے ساتھ ان ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔"

لیکن اس کے بعد اپنی رائے ان الفاظ میں قلم بند کرتا ہے:-

واللبيب منهم يقصد بصلاته بخالق ومقيم التماثيل من الاصنام والصور مقام قبلة والجاهل منهم ومن لا علم له يشرك الاصنام بالهية الخالق ويعتقد هما جميعا وان عبادتهم الاصنام تقربهم الى الله زلفى

(المسعودی ص۱۹۱)

لیکن جو لوگ عقل وخرد والے ہیں اُن کے سامنے اپنی دعاؤں میں خدا ہی مقصود ہوتا ہے اور مورتیوں کو وہ اپنے سامنے بطور قبلہ (یعنی رُخ کرنے کی سمت) کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔ لیکن جنہیں علم نہیں ہے اور جو جاہل ہیں وہ خدا کی الوہیت میں ان مورتیوں کو بھی شریک کرتے ہیں اور جو دونوں باتوں کے معتقد ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ان مورتیوں کی عبادت ان کو خدا سے نزدیکی عطا کرتی ہے۔

ل اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بُت پرستی کی یہ آخری تاویل وتوجیہ ہو سکتی ہے جس سے مسلمان آج سے سینکڑوں بلکہ ہزار سال پہلے واقف تھے لیکن سچ پوچھئے تو یہی توجیہ القول بما لا یرضی به قائله (یعنی قائل کی مرضی کے خلاف خواہ مخواہ اسکی طرف سے بات بنانا ہے) بُت پرست دُنیا میں خصوصاً ہندوستان میں کروڑوں کی تعداد میں اب بھی موجود ہیں خود ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اپنے معبودوں کے متعلق ان کا کیا خیال ہے۔ آفتاب و ماہتاب گنگا وغیرہ کے پوجنے والوں کو تو جانے دیجئے کہ ان کو تو خود ان کے پوجنے والے خدا کی مخلوق مانتے ہیں کسی کا عقیدہ نہیں ہے کہ دُنیا کو گنگا نے یا سورج نے یا چاند نے پیدا کیا ہے بلکہ ان ہی کو مخلوقات الٰہی میں شمار کرتے ہیں۔ رہیں مورتیاں سو وہ ایک قسم کی تو ہیں نہیں انسانوں کی بھی ہوتی ہیں اور حیوانوں کی بھی نمائندگی ان ہی مورتیوں سے ہوتی ہے (انسانوں

(اگلا صفحہ)

اس نے لکھا ہے کہ:۔

ھو رأی الھند فی العالم والجاھل یعنی ہندوستان کے عالم اور جاہل سب

(ایضاً) کا یہی خیال ہے۔

کچھ بھی ہو میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کا غیر قوموں کے ساتھ

(بقیہ سابق) یا جانوروں کی کرتی ہیں جو ان کے اصل معبود ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان معبودوں کو جنکی مورتیاں نمائندگی کرتی ہیں اُن کو بھی خود ان کے پوجنے والے خدا کی مخلوق ہی خیال کرتے ہیں۔ بہرحال ان مورتیوں میں ایسی کوئی مورتی نہیں ہے جسکے متعلق سمجھا جاتا ہو کہ وہ کسی مخلوق کی نہیں بلکہ خالق سموات والارض کی نمائندہ ہے اور بالفرض مان بھی لیا جائے کہ ان مورتیوں کو خالق ہی کی نمائندہ بنا کر جہلا نہیں تو ان کے خواص پوجتے ہیں جیسا کہ المسعودی کا بیان ہے تو سوال یہ ہے کہ ان مورتیوں کی شکل جیسا کہ میں نے عرض کیا آدمی کی ہوتی ہے یا جانور کی آدمی میں بھی مرد کی یا عورت کی، پھر کیا ان لوگوں کے خیال میں خدا مردوں یا عورتوں کی یا معاذ اللہ جانوروں کی شکل رکھتا ہے؟ اور خدا جو خود ہندوؤں کے نزدیک بھی نرنکار لیس کمثلہ شیٔ ہے جب اسکی کوئی صورت نہیں ہے تو صورت والی مورتی سے خدا کی طرف ذہن کو منتقل کرنیکے کیا معنی؟ کیا بلی کی تصویر سے طوطے کا تصور جما یا جا سکتا ہے؟ صاحب صورت اور صورت میں کسی قسم کا تعلق بھی تو ہونا چاہیئے۔ رہا مخلوق ہونیکا تعلق تو ان میں ان مورتیوں اور بتوں کی کیا خصوصیت ہے اس لحاظ سے سارا آسمان و زمین عالم کا ذرہ ذرہ خدا کیطرف ذہن کو منتقل کرانے کے لئے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس توجیہ کو صرف بے معنی کی دلیل تو میں قرار دیتا ہوں لیکن صحیح توجیہ بت پرستی کی میرے نزدیک یہ نہیں ہے۔ خالق ہی کو پوجنا ہے تو اسکے لئے ان جھگڑوں کی کیا ضرورت ہے خصوصاً جب مسعودی بھی کہتے ہیں کہ عوام ان ہی کی وجہ سے واقعی شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ۱۲

اسی قسم کے فیاضانہ برتاؤ اور سلوک کا نتیجہ یہ تھا کہ قومیں ان سے مانوس ہوتی تھیں بجائے بھڑکنے کے ان سے قریب ہوتی تھیں۔ ان کی باتوں کو وہ سنتی تھیں سچائیوں کو دلوں میں اُتارنے کا یہی کارگر حربہ ان کے پاس تھا۔ یہی لوگ تھے جنکی بدولت آج جاوہ، سماٹرا، انڈونیشیا، اور چین وغیرہ ممالک میں بے تیغ و تفنگ کروڑوں کی تعداد میں مسلمانوں کی آبادیاں پائی جاتی ہیں، بُرا بھلا کہکر گالی گلوچ سے کبھی دُنیا صداقت کی دعوت و تبلیغ میں کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ میں تو ان کتابوں میں محض واقعات کو پڑھکر حیران ہوگیا۔ ہمیشہ سے یہ سنتا ہوں کہ ہندوستان کے باشندوں کا خیال ہے کہ دریائے شور کو عبور کر کے دوسرے ملکوں میں جانا مذہباً ان کے یہاں ممنوع ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ انگریزی عہد کے عام الحاد اور بے دینی نے ہندوؤں کو اس مذہبی پابندی سے آزاد کیا ہے۔

علیحدہ علیحدہ کھانے کی رسم

لیکن یہی سلیمان تاجر جسکے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ تیسری صدی کا ابتدائی آدمی ہے اپنی کتاب میں ہندوؤں کی اس رسم کا ذکر کرتے ہوئے یعنی ایک برتن میں کھانے کا رواج ان میں نہیں ہے لکھتا ہے کہ :-

"قاعدہ یہ ہے کہ ایک برتن میں دو آدمی بھی مِل کر ان میں نہیں کھاتے اور نہ ایک دسترخوان پر بیٹھکر دو آدمی کھا سکتے ہیں۔ اس کو سخت عیب خیال کرتے ہیں"

اس نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں اور بڑے لوگوں کا قاعدہ ہے کہ

ناریل کے پتوں سے روزانہ اُن کے لئے ایک ایسی چیز بنائی جاتی ہے جو رکابی کے مانند ہوتی ہے اسی ناریل کے پتوں سے بنے ہوئے دونے یا برتن میں وہ کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد فوراً اس کو پھینک دیا جاتا ہے جس میں بچا کھچا کھانا بھی رہتا ہے اور دوسرے دن پھر نیا دونا ان ہی پتوں کا بنایا جاتا ہے۔

ہندوؤں کے سمندری سفر نہ کرنے کے عام خیال کی تردید اور چھوت چھات

یہ بیان کرنے کے بعد اُنہوں نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے اس خیال کی قطعاً تردید ہوتی ہے کہ سمندر پار کے سفر کو ہندوؤں نے صرف انگریزوں کے زمانہ میں دینی کمزوری میں مبتلا ہونے کے بعد اختیار کیا ہے سلیمان نے جو کچھ لکھا ہے لفظی ترجمہ اُس کا درج کر دیتا ہوں۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ ایک دو نہیں دوسری اور تیسری صدی ہجری میں سینکڑوں کی تعداد میں ہندو سمندر کو عبور کر کے اسلامی ممالک میں ان لوگوں کے پاس آتے جاتے رہتے تھے جن سے ان کے تجارتی کاروبار تھے، میں تو خیال کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاقی برتاؤ نے ہندوؤں کو اپنا اتنا گرویدہ بنا لیا تھا کہ اُن کے گھر کو وہ اپنا گھر خیال کرنے لگے تھے یہ جس زمانہ کا قصہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان کا یہ وہ زمانہ ہے کہ اس ملک سے مسلمان صحیح طور پر عموماً واقف بھی نہیں تھے۔ اپنے ملک کا راج خود ہندوؤں کے اقتدار میں تھا۔ سلیمان کا بیان ہے کہ :-

"ہندوستان کے باشندے جب سیراف آتے ہیں (یعنی ایرانی
بندرگاہ جہاں سمندر ہی کے سفر کے بعد آدمی پہونچ سکتا ہے)
اور سیراف کے ممتاز تاجروں میں سے کوئی تاجران کی دعوت
کرتا ہے عموماً یہ سو یا سو سے زیادہ یا کچھ کم ہوتے ہیں تو
ضرورت ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس الگ الگ طباق
رکھا جائے جس میں وہ سب کچھ رکھدیا جاتا ہے جسے وہ کھاتے ہیں
اس میں کوئی دوسرا قطعاً شریک نہیں ہو سکتا" (سلیمان صفحہ ۱۴۶)

میری نظر سے جب یہ عبارت گذری تو جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدیم خوشگوار تعلقات کے ثبوت کی ایک جدید شہادت کا انکشاف مجھ پر ہوا اور محسوس ہوا کہ اخلاقی قوت سے چاہا جائے تو جو چیز حکومت کی تلوار سے بھی بآسانی حاصل نہیں ہو سکتی بسہولت ہم اس کو اپنے قابو میں لا سکتے ہیں خیال تو کیجئے آج سے ہزار سال پیچھے کے ہندوستان کو اس کے مذہبی تقشف اور تصلب کو! اور پھر سوچئے کہ اِکے دُکے نہیں سو سو بلکہ سو آدمیوں سے بھی اوپر اسی ہندوستان کے رہنے والے جو سمندر پار کے سفر کو جس کا کہا جاتا ہے مذہباً ناجائز سمجھتے تھے، وہ فراخدلی کے ساتھ مسلمانوں کے ایسے ممالک میں جہاں مسلمان ہی مسلمان آباد ہیں سمندر کو عبور کر کے آرہے ہیں جا رہے ہیں، اور صرف آجا نہیں رہے ہیں بلکہ مسلمانوں کی دعوتیں قبول کرتے ہیں، ان کے مہمان بنتے ہیں۔ اگرچہ اسی کے ساتھ اپنی قومی خصوصیتوں کو

بھی باقی رکھتے ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ جب علیحدہ علیحدہ کھان پان کے ہندی طریقہ کو سلیمان نے بیان کیا تھا تو اسی کے ساتھ اسی کھان پان کے متعلق ہندوؤں کے اس مشہور طریقۂ عمل کا اس نے کیوں ذکر نہ کیا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمان تو مسلمان خود ان لوگوں کے ہاتھوں کی پکی ہوئی چیزوں کے کھانے سے بھی جیسا کہ سب جانتے ہیں ہندو پرہیز کرتے ہیں جو باوجود ہندو ہونے کے خاص خاص طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ برہمن ہوں یا چھتری یا ویش، ہر ہندو کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیز نہیں کھا سکتے بلکہ خاص خاص ذات کے افراد کو اس کا استحقاق دیا گیا ہے جو ان کے لئے رسوئی تیار کر سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ "چھوت چھات" اور وہ بھی "کھان پان" آج ہندو قوم کے مذہب کا جو مرکزی مسئلہ ہے، کہنے والوں نے تو اسی وجہ سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آج سارا ہندو مذہب صرف باورچی خانوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے، ہمیشہ ہندوستانی اسٹیشنوں کی ان عجیب و غریب آوازوں کو دنیا کی قوموں میں تعجب کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے کہ پکارنے والے ان اسٹیشنوں میں "ہندو پانی" "مسلمان پانی"، "ہندو بسکٹ" "مسلمان بسکٹ" "ہندو پان" "مسلمان پان" وغیرہ پکارتے رہتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہندوستان سے قافلوں کی شکل میں جو لوگ اسلامی ممالک میں جاتے تھے اور مسلمانوں کی دعوتوں کو قبول کرتے تھے اگر کھانے پینے کے ان قوانین کی پابندی اس زمانہ میں بھی کرتے تھے تو لوگ

الگ کھانے کے اس دستور کو جہاں بیان کیا گیا تھا، اسی کے ساتھ ہندوؤں کے کھانے پینے کے ایسے اہم دستور کے ذکر کو ترک کیوں کر دیا۔؟

مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس زمانہ میں "چھوت چھات" یا قرآنی اصطلاح میں چاہیئے تو کہہ سکتے ہیں کہ "لا مساسیت" کے اس خاص ہندی دستور کی پابندی کا رواج شاید اس زمانہ میں تھا ہی نہیں، یا تھا بھی تو اس قانون کی پابندی میں اتنی نزاکتیں نہیں برتی جاتی تھیں جن کا معائنہ پچھلے دنوں میں ہم کر رہے ہیں۔ ورنہ اس کے کوئی معنے ہو سکتے ہیں کہ ہندوؤں کے روزانہ غسل، روزانہ دتادن (سواک)۔ کھانے پینے میں علیحدگی پسندی وغیرہ وغیرہ جزئیات کا تو ذکر کیا جاوے اور ہندوستان والوں کی اتنی بڑی اہم خصوصیت کو غیر اہم قرار دے کر خاموشی اختیار کی جاوے۔

اب میں کیا کہوں، میں نے اس سلسلے میں ممکنہ حد تک اسی قسم کی تمام کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور بہت تلاش کیا۔ لیکن ان مصنفین میں سے ایک آدمی بھی ہندوستان کے چھوت چھات کے مسئلہ کا ذکر نہیں کرتا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اصل واقعہ کیا ہے۔

جمادات اور نباتات، حیوانات تک میں سے کسی چیز کے چھونے سے انکو پرہیز نہیں ہے اور کسی قسم کی ناپاکی کا احساس ان میں پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اچانک ان ہی لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ خود اپنے ابنائے جنس کو دیکھکر چیخنے لگتے ہیں کہ مجھے نہ چھونا۔ میری چیزوں کو ہاتھ نہ لگانا۔ بعضوں کا یہ خیال کہ یہ تعلق ان کا صرف ان قوموں کی حد تک محدود ہے جو ہندو نہیں ہیں اسلیئے صحیح نہیں ہے کہ

کہ "چھوت چھات" کے یہ جھگڑے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا خود ہندو قوم کے مختلف طبقات کے درمیان بھی پائے جاتے ہیں یعنی چولہے آپکو ہندو کہتے ہیں محض ہندو کہہ دینے سے "چھوت چھات" کے قوانین کی پابندیوں سے وہ مستثنیٰ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ بلکہ ان میں بھی خاص خاص طبقات کے لئے خاص ذاتوں کے افراد ہیں جنہیں چھونے کی اجازت دی جاتی ہے۔ ورنہ کتنے ہندو وہ ہیں جن کے چھونے اور ہاتھ لگانے سے برہمنوں یا چھتریوں کے برتن اور ان کے کھانے ناپاک ہو جاتے ہیں۔

بہر حال عرض کرنے کی بات یہ ہے کہ جہاں ان مصنفین کی کتابوں میں "چھوت چھات" کے خاص ہندی خصیصہ کا ذکر نہیں پایا جاتا وہیں یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کی گاؤ پرستی کی رسم کو بھی ان لوگوں میں سے کسی نے بیان نہیں کیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ گائے نہیں بلکہ گائے اور بھینس کے گوبر کے ساتھ ہندوستان کے عام باشندوں کو جو دلچسپی ہے اس نکتہ کو ان لوگوں نے بیان کیا ہے۔ بزرگ بن شہریار اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

"ہندوستان کے سیٹھ اور ساہوکار یا ان کے فوجی آدمی یا اسی قسم کے کسی بڑے امیر کو لے لیجئے ہی کی عورتیں کیوں نہ ہوں جب راستے سے گذرتی ہیں اور ان کی نظر گائے یا بھینس کے گوبر پر پڑ جاتی ہے اس صورت میں اگر ان کے ساتھ اس گوبر کا اٹھانے والا کوئی آدمی ہوتا ہے تو اسکو حکم دیا جاتا ہے کہ اسے اٹھا لے ورنہ عمر سی خاتون اس گوبر پر خاص قسم کا نشان بنا دیتی ہے تاکہ

راہ گیروں کو معلوم ہو جائے کہ گوبر کا یہ چوتا کسی شخص کی ملک میں داخل ہو چکا ہے۔ پھر اٹھانے والے کو بھیجکر گوبر منگوا لیا جاتا ہے۔

(بزرگ بن شہریار صہ ۱۹۲)

آپ خیال کرسکتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس قسم کی معمولی معمولی جزئی باتوں تک کا ذکر کیا ہے۔ اگر ان کے زمانے میں بھی ہندوستان میں "چھوت چھات" کا رواج ہوتا۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا ذکر ترک کر دیتے؟

قدیم ہند میں گوشت خواری کا رواج

سلیمان لکھتا ہے کہ:۔

"ہندوستان اور چین ان دونوں ممالک کے باشندوں کا عام دستور یہ ہے کہ جب کسی جانور کے گوشت کھانے کا ارادہ کرتے ہیں تو اُسے ذبح نہیں کرتے بلکہ اُس کی کھوپڑی پر ضرب لگاتے ہیں تا اینکہ جانور مر جاتا ہے [1]" (سلیمان صہ ۵۶)

[1] انسانی خوراک کا وہ عنصر جس کا نام لحم ہے تیار ہی نہیں ہو سکتا جب تک ان میں نباتاتی زندگی کو آگے بڑھکر حیوانی زندگی کے آثار نہ پیدا ہو لیں اسلئے اس خوراک کے حصول میں حیوانی زندگی کا ازالہ ضروری ہے جیسے نباتاتی خوراک کے حصول میں نباتاتی زندگی کا ازالہ ناگزیر ہے۔ مگر حیوانی زندگی کے ازالہ کی جو شکل دنیا کی قوموں میں پائی گئی ہے یا پائی جاتی ہے اسلامی ذبح اسکے مقابلہ میں غذائی حیوانوں کے لئے رحمت معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کا حال تو یہ ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں تاتاریوں کا طریقہ یہ تھا کہ جانور کے ہاتھ پاؤں کو باندھ دیتے تھے۔ پھر دل کے پاس اسی زندہ جانور کے سوراخ کر کے اسی سوراخ میں ہاتھ ڈال دیتے اور آہستہ آہستہ اس جانور کے دل کو چٹکیوں سے ملتے رہتے تا اینکہ اس کی جان نکل جاتی۔ یا کھینچ کر دل کو باہر نکال لیتے تھے۔ ۱۲

(دیکھو صبح الاعشیٰ قلقشندی صہ ۳۱۱ ج ۴)

سلیمان کے اس بیان سے اولاً اسی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ گوشت خوری کے متعلق ہندوستان میں کسی قسم کا استنکاف وانکار اس زمانہ میں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نہیں پایا جاتا تھا۔ بلکہ اس سلسلے میں بزرگ بن شہریار نے جانوروں کے گوشت کے استعمال کا جو طریقہ ہندوستان میں مروج تھا اس کو بیان کرتے ہوئے یعنی یہی بات کہ جانور کے سر پر ضرب لگا کر اس کو مار ڈالتے ہیں تب اس کے گوشت کو استعمال کرتے ہیں۔ اسکے بعد لکھتا ہے کہ

"صیمور اور سوبارہ (یہ ہندوستان کے ساحلی شہروں کے اس زمانہ میں نام تھے اور مشہور بندرگاہیں تھیں) کے بعض بڑے آدمیوں کو دیکھا گیا کہ ایک مرے ہوئے چوہے کے سامنے وہ گذر رہا تھا۔ مردہ چوہے کو دیکھکر خود اس رئیس نے اسکو اپنے ہاتھ سے اٹھا لیا اور اپنے بیٹے یا غلام کے حوالے کرکے حکم دیا کہ اسے گھر لے جائے پھر اس نے اس چوہے کو اپنی غذا بنائی"۔ اس کے بعد یہ بھی بیان کیا ہے کہ:۔

"جو چیزیں ہندوستان میں کھائی جاتی ہیں اُن میں چوہوں کا شمار ان کے نزدیک بہترین غذاؤں میں ہے"۔ (عجائب الہند ص ۱۶۴)

ہندوستانی گینڈے کا تذکرہ کرتے ہوئے اور یہ لکھتے ہوئے کہ رہمی کے راجہ کے علاقہ میں ایک خاص قسم کا گینڈا ہوتا ہے سلیمان تاجر اور المسعودی دونوں نے یہ بیان کرنے کے بعد کہ:۔

"اسکی پیشانی پر ایک سینگ ہوتا ہے رہمی کے ملک کے گینڈوں کی

خصوصیت یہ ہے کہ بہ نسبت دوسرے مقامات کے گینڈوں کے
اسکے سینگ زیادہ چکنے چمکیلے اور صاف ہوتے ہیں، رنگ ان کا
سفید ہوتا ہے اور بیچ میں اُسکے قدرتی طور پر بعض ایسے
نشانات سیاہ خطوط سے بنے ہوتے ہیں جو کبھی انسان کبھی کسی
پرند مثلاً مور (طاؤس) کبھی مچھلی کبھی خود گینڈے یا دوسرے
جانوروں کی شبیہ معلوم ہوتی ہے، لوگ ان سینگوں کو کاٹ کر
کمر بندوں میں بطور زیور کے لگاتے ہیں، خصوصاً چین کے
سلاطین اور حکام میں خاص طور پر ان تصویری سینگوں کے
استعمال کرنے کا ذوق پایا جاتا ہے، بڑی بڑی قیمتیں دیکر لوگ
خریدتے ہیں اسی لئے انکی قیمتیں کبھی کبھی دو ہزار اشرفیوں تک
بھی پہونچ جاتی ہیں۔

المسعودی نے لکھا ہے کہ:۔

"یہ خصوصیت بجز رہمی کے جنگلوں کے گینڈوں کے اور کسی
دوسری جگہ کے گینڈوں کے سینگ میں نہیں پائی جاتی [ص۲۵، ج۱]

ان باتوں کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ:۔

ہندوستان کے باشندے اس کا یعنی گینڈے کا گوشت
خوب کھاتے ہیں۔"

بلکہ سلیمان تاجر نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"اس کا گوشت حلال ہے کیونکہ یہ تو اسی قسم کا ایک جانور ہے جیسے"

گائے بھینس یعنی ان ہی جانوروں کی طرح وہ بھی جگالی کرتا ہے
ہیں نے بھی اس کا گوشت کھایا ہے[1]"۔ (سلیمان ص۳۱)

المسعودی کہتا ہے کہ:-

لانہ نوع من البقر والجوامیس — وہ گائے اور بھینس ہی کی ایک قسم ہے
(ص۲۵۶ جلد ۱)

غرضیکہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ "چھوت چھات" یعنی لامساسیت اور گائے جیسے ہم ہندی رسوم کے متعلق ان لوگوں کی خاموشی کے اسباب کیا ہیں؟ حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی کتنی غیر اہم باتوں کے تذکرے میں انہوں نے کتنی فیاضی سے کام لیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے ساحلی مقامات اور جنوبی ہند کی ریاستوں میں جہاں ان لوگوں کی آمد و رفت زیادہ تھی وہاں ان کے زمانہ تک ہندوستان کے ان رسوم کا رواج نہ پہونچا ہو۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان رسم و رواج کے لحاظ سے بلکہ دوسرے تاریخی پہلوؤں کے اعتبار سے اتنا شدید انقلابی ملک ہے کہ کسی قسم کا قطعی فیصلہ کسی مسئلہ کے متعلق مشکل ہے۔ یعنی یہ طے کرنا کہ کونسی رسم اور کونسا رواج ہندوستان میں قدیم زمانہ سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اور کون کونسی چیزیں اس ملک میں وقتاً فوقتاً دوسرے

---

[1] اسلامی شریعت کی رو سے گینڈے کے متعلق الدمیری نے حیاۃ الحیوان میں بھی حلال کرنے کا حکم درج کیا ہے اور وجہ بھی یہی لکھی ہے کہ یہ نباتات خور چوپاؤں میں ہے اور جگالی کرتا ہے۔ الغرض سارے حلال جانوروں کے صفات انہیں پائے جاتے ہیں (دیکھو حیاۃ الحیوان ج۱ ص۲۲۹)

ممالک و اقالیم سے منتقل ہو ہو کر یہاں پہنچی ہیں۔ ایک ایسا تغیر پذیر سیال ملک کہ چوتھی صدی میں آپ ان ہی سیاحوں کی زبانی سن چکے کہ سندھ اور بالائی پنجاب کا سارا علاقہ بدھ مت کے رہنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور آج یہ حال ہے کہ بیچارے بدھوں کو ان ہی علاقوں میں انگلیوں پر بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔

رائے بہادر مہا مہوا پادھیا گوری شنکر ہیرا چند اوجھا صاحب جیسے محقق جو ہندو مذہب اور اس کے رسوم و رواجات کے متعلق سند ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی کتاب "قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" میں بکثرت ایسی چیزیں میں نے پڑھیں۔ جن کے متعلق میرا خیال تھا کہ ہندو مذہب کے قدیم عناصر ہیں لیکن مہا مہوا پادھیا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل پچھلے زمانہ میں ان کا اس ملک میں رواج ہوا۔ گنیش کی مورتی جس کی پوجا شمالی اور جنوبی ہند میں بڑے دھوم دھام سے ہر سال کی جاتی ہے اور مشکل ہی سے ہندوؤں کی کوئی ایسی جگہ ہوگی جہاں سونڈ رکھنے والی یہ مورتی براجمان نظر آتی ہو۔ لیکن اوجھا صاحب اسی گنیش کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ:-

"جنوبی ہند ہو یا شمالی کسی جگہ چوتھی صدی عیسوی سے پہلے کی نہ گنیش کی کوئی مورتی ملی اور نہ اس زمانہ کے کتبوں میں ہی اس کا کچھ اشارہ ہے" (ص ۲۳)

وہ اس مورتی کے سونڈ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"گنیش کے منہ کی جگہ سونڈ کی ایجاد نہ جانے کب سے ہوئی۔"

ہندو مذہب کے اس فاضل نے خود "گوشت خوری" کے متعلق بھی یہی لکھا ہے کہ کسی زمانہ میں گوشت خوری کا اس ملک میں بہت رواج تھا بلکہ ان ہی کا یہ بیان بھی ہے کہ:-

"اس پر ویاس سمرتی میں تو یہاں تک کہدیا گیا ہے کہ گوشت نہ کھانے والا برہمن گناہگار ہوجاتا ہے۔" (ص ۶۶ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب)

گوشت سے موجودہ احتراز کا سبب

گوشت خوری کے متعلق ہندوستان کے جدید رجحان کی توجیہ اوجھا صاحب نے یہ کی ہے کہ:-

---

[1] واقعہ تو یہی ہے کہ ہر قوم کو ہر زمانہ میں اس کا اختیار ہے کہ جس قسم کے عقاید و اعمال چاہئے اپنے لئے مقرر کرلے دوسرے مذاہب و ادیان والوں کو اس کا حق نہیں ہے کہ ان کی کتابوں سے ان پر حجت قائم کریں۔ اپنی کتابوں کی تفسیر و تاویل کا ان کو حق ہے جو چاہیں سمجھیں آج ہندوؤں نے خواہ اس کی وجہ کچھ ہی ہو اگر یہ طے کرلیا ہے کہ سرے سے گوشت نہیں کھائیں گے، یا کسی خاص جانور کا گوشت نہ کھائیں گے۔ تو ان کی کتابوں کو یا ان کی تاریخ کو دکھا دکھا کر ہم ان کو اس رویہ کے ترک پر مجبور نہیں کرسکتے جیطرح ہندوؤں کے لئے بھی سزاوار نہیں ہے کہ جس چیز کو وہ اپنے لئے ناجائز سمجھتے ہیں خواہ مخواہ دوسروں کو بھی اس کے ناجائز سمجھنے پر مجبور کریں

"جین اور بدھ دھرم کے اثر سے رفتہ رفتہ اس کا رواج ہوتا گیا" (صـ۲۷ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب)

لیکن جینیوں اور بدھ متی والوں میں گوشت خوری جیسی اجتماعی فطری چیز یعنی ہندوستان کے سوا دنیا کے کسی ملک اور کسی قوم میں آدمی کی اس فطری غذا کو نفرت کا اظہار کسی زمانہ میں نہیں کیا گیا ہے اور ایک ایسی عام بات کے خلاف ان میں ترکِ لحمیات کا جذبہ آخر کیوں پیدا ہوا؟ ہو سکتا ہے جیسا کہ بعضوں نے لکھا بھی ہے کہ "ویدک دھرم کے آخری دور میں پنڈتوں اور برہمنوں نے قربانی یعنی ہدیہ یا یگیہ (جو اضحیہ کے مخرج سے قریب تر لفظ ہے) کو سب کچھ قرار دے کر افراط کا ایسا طریقہ اختیار کیا کہ خون کے سوا اس زمانہ میں ہندوستان کی سطح پر اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اسی کا ردعمل تھا۔ جو جینیوں اور بدھ متی والوں کے قلوب پر اثر انداز ہوا لیکن ان سیاح مؤرخین نے جانوروں کے مارنے کے جس دردناک طریقے کا مشاہدہ اپنے زمانے میں ہندوستان میں کیا تھا۔ سچ پوچھیے تو بے رحمی کا یہ سلوک انسانی فطرت کے لئے زیادہ دن تک قابلِ برداشت ہو بھی نہیں سکتا تھا۔[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نرم و رقیق

[1] یہی وجہ ہے کہ جو آسمانی ادیان ہیں گوشت حاصل کرنے کیلئے خاص قاعدے مقرر کئے گئے ہیں۔ جن میں سب سے بڑی بات جانوروں کے خالق اور مالک کے نام سے انکو زندگی کے سپرد کرنے ہیں آمادہ کرنا ہے۔ یوں بظاہر کچھ ہی سمجھا جائے لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مالک وخالق کی تسبیح وتحمید کا علم ساری کائنات کو ہے جن میں جانور بھی داخل ہیں مرنا تو بہرحال ہر زندہ کے لئے ضروری ہے ان کو ہو سکتا ہے کہ خدا کے نام پر جانوروں سے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

قلب والوں کو پہلے رحم کے اس طریقے سے گوشت حاصل کرنے سے زیادہ آسان یہی معلوم ہوا کہ گوشت کھانا ہی چھوڑ دیں۔ پھر بتدریج ان ہی کی اصطلاح میں بات آگے بڑھی۔ بڑھتے بڑھتے اس منزل تک پہونچ گئی کہ سب سے زیادہ قربانیوں کی شوقین قوم قربانی کی مخالف بن گئی۔ تاریخ کی نگاہوں میں اس قسم کے واقعات عجیب تماشا ہیں۔

شاید میں اپنے اصل مضمون سے حسب دستور کچھ زیادہ دور ہو گیا۔ گفتگو ہندوستان کے متعلق یہ ہو رہی تھی کہ قدیم مسلمان سیاحوں نے اس ملک اور اس کے رسم و رواج، یہاں کے باشندوں کے بود و باش، رہن سہن کے طریقوں کو کتنی بے تعصبی اور کھلے دماغ کے ساتھ دیکھا اور بیان کیا ہے۔

اہل ہند کا اظہار تفاخر

المسعودی کا (جو مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود کی اولاد میں سمجھے جاتے ہیں) حال تو یہ ہے کہ ہندوستان کے ذکر پر پہونچنے کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قلم بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اپنی کتاب "مروج الذہب" میں ہندوستان کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

(دیکھئے صفحہ سے) ان کی جان جب طلب کی جاتی ہے تو اس وقت ان پر اپنے جبلی علم و معرفت کا بتایا ہوا کیا حال طاری ہوتا ہے اور اسکے ذبح کرنے کا دستور اور ذبح میں حلال کرنے کے آلے کو کہاں تک تیز تر کرنا۔ اس طریقہ میں علاوہ اس پاکیزگی کے جو خون کے اخراج سے گوشت میں پیدا ہو جاتی ہے جان نکلنے میں بھی سہولت کا ایک پہلو یقیناً مستور ہے ۱۲

"علم و نظر والوں کا وہ طبقہ جس نے عالم کی ابتدا و انتہا کی تہ تک پہونچنے کی کوشش کی ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان دُنیا کے قدیم زمانے میں روئے زمین پر ایک روشن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس ملک میں صلاح اور حکمت کی بنیادیں شروع ہی میں قائم ہو گئی تھیں۔"

(مسعودی جلد ا ص۱۶۱)

پھر آگے اپنے مسموعات کا ذکر کیا ہے جنہیں اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آج مہذب ترین قومیں جن نتائج تک بلکہ ان نتائج کے صرف خیال تک پہنچی ہیں، ہندوستان کو اپنی عملی زندگی میں شریک کر چکا تھا یعنی اس نے لکھا ہے کہ:-

"جب دنیا میں مختلف قبائل و اقوام کی شکل میں نسل انسانی تقسیم ہو گئی (اور ہندوستان میں بھی ایک قوم آباد ہوئی) تو اس نے یہ طے کیا تھا کہ اپنے ملک کو ملک والوں کے اقتدار میں لاکر (دوسری قوموں سے تعلق کی نوعیت یہ ہو گی) کہ نہ ہم کسی دوسرے ملک اور دوسری قوموں سے جنگ کریں گے نہ لڑائی۔ البتہ ہماری طرف کوئی نگاہ اُٹھا کر دیکھے گا تو پھر ہم اس پر چڑھائی کرینگے تاکہ وہ ہماری اطاعت قبول کر لے۔" ایضاً ص۱۵۲

اس نے ہند والوں کے ان دعاوی کو بھی نقل کیا ہے کہ:-

"ہم ہی سے ابتدا ہوئی ہے اور ہم ہی پر انتہا بھی ہو گی اور آخری

انجام دنیا کا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ شروع بھی ہم ہی کرتے ہیں
اور ختم بھی ہم ہی پر ہوتا ہے اور سارے کرۂ زمین میں ادب
کی اشاعت ہمارے ملک ہی سے ہوتی ہے۔" (ایضاً ص۱۰۲)

الغرض یہ اور اسی قسم کی بیسیوں باتیں اس سلسلہ میں المسعودی نے نقل کی ہیں اور اس طور پر نقل کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی ان خصوصیات کا وہ منکر نہیں ہے اور یہی مجھے کہنا ہے کہ واقعہ بجائے خود کچھ بھی ہو، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک قطعی غیر مسلم کی حیثیت اس وقت ہندوستانی کی ہے لیکن مسلمان مورخ نہ صرف اپنے "دیدہ" ہی کو بلکہ "شنیدہ" کو بھی اس ملک کی تعریف میں بغیر کسی اعتراض و تنقید کے نقل کرتا ہے اور المسعودی کی یہ باتیں تو خیر "شنیدہ" ہیں۔ ان عجیب و غریب دل و دماغ رکھنے والے مسلمانوں کی کچھ "دیدہ" رپورٹوں کو بھی سن لیجئے۔ شیخ مبارک انباتی تقریباً دوسری صدی ہجری یا اسکے کچھ ہی بعد کے آدمی ہیں۔ ان کے حوالے سے صاحب "مسالک الابصار" ناقل ہیں، کہ میں نے شیخ مبارک سے ہندوستان کے متعلق دریافت کیا، تو مجھ سے انہوں نے بیان کیا کہ:

"نہروں کا حال اس ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ بڑی اور چھوٹی نہروں کو ملا کر اگر شمار کیا جائے تو ان کی تعداد ایک ہزار سے کم نہ ہوگی بعض نہریں تو اس ملک میں اتنی بڑی بڑی ہیں کہ دریائے نیل جیسے ہو سکتی ہیں اور بعض نیل سے چھوٹی ہیں اور عموماً نہریں اس ملک کی اس قسم کی ہیں جیسے عام طور پر دنیا میں ہوتی ہیں۔"

سرزمینِ ہند کی زرخیزی اور موسموں میں اعتدال

شیخ مبارک ہی کا بیان ہے کہ:۔

"عام قاعدہ ہندوستان کی آبادی کا یہ ہے کہ عموماً ان ہی چھوٹی نہروں کے کنارے اس ملک کے شہر اور اس کی بستیاں آباد ہیں ملک گھنے اشجار سے بھرا ہوا ہے۔ وسیع و عریض سبزہ زاروں اور مرغزاروں کی حد نہیں ہے۔"

اور سب سے دلچسپ چیز ہندوستان کے موسموں کے متعلق شیخ مبارک کا یہ عجیب و غریب احساس ہے کہ:۔

"اپنے موسم کے لحاظ سے ہندوستان ایک معتدل ملک ہے اسکے فصلوں میں حالات کے لحاظ سے تفاوت نہیں پایا جاتا یعنی حد سے متجاوز یہاں کا کوئی موسم نہیں ہے، نہ اس ملک کی گرمی برداشت کی حد سے زیادہ ہے اور نہ یہاں کی سردی۔"

آخر میں شیخ کے الفاظ ان لوگوں کیلئے جو غریب ہندوستان کو گھر کی مرغی قرار دیئے ہوئے ہیں۔ سننے کے قابل ہیں۔ کہتے ہیں کہ:۔

"بلکہ سمجھنا چاہیئے کہ ہندوستان کے کل مہینے گویا بہار ہی کے مہینے ہیں۔ اس ملک میں ہمیشہ ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور بادِ نسیم کے جھونکوں سے ہر مہینے میں آدمی لطف اندوز ہوتا رہتا ہے یہاں چار مہینے مسلسل بارش ہوتی رہتی ہے زیادہ بارش بیچ کے

آخری مہینوں سے صیف (گرمی) کے اختتام تک ہوتی ہے۔[1]
(صبح الاعشیٰ قلقشندی ص ۶۸)

اور یہ بیان کچھ ایک شیخ مبارک ہی کا نہیں ہے۔ قلقشندی نے بھی "تحفۃ الالباب" نامی کتاب کے حوالے سے اس کے مصنف محمد بن عبدالرحیم اقلیشی کا بیان ہندوستان کے متعلق یہ نقل کیا ہے:۔

"ہندوستان بڑا ملک ہے انصاف و عدل کی یہاں بہتات ہے نعمتوں سے معمور ہے۔ سیاست اس ملک کی بہت اچھی ہے دوامی خوش حالی کا دور دورہ ہے اس ملک میں ایسا امن ہے جس میں خوف کا نام نہیں"۔

(۱) واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے موسموں کی قیمت کا اندازہ دوسرے ممالک کے سخت ترین گرم و سرد موسموں ہی کے بعد ہو سکتا ہے اور شیخ مبارک کے بیان کو ہم اسی محل پر محمول کر سکتے ہیں بلکہ بجائے کل ہندوستان کے اگر جنوبی ہند اور جنوبی ہند میں بھی ممالک محروسہ سرکار آصفیہ کے موسموں کو ہم اپنے سامنے رکھیں تو شیخ مبارک کے بیان کی توثیق ہم بغیر تاویل کے بھی کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پایۂ تخت آصفیہ حیدرآباد دکن کی گرمی و سردی دونوں حد اعتدال سے متجاوز نہیں ہوتیں۔ کم از کم حیدرآباد والے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے بارہ مہینے بہار کے مہینے ہیں۔ اور شب و روز نسیم لطیف کے جھونکے ان کے ملک میں چلتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوستان کے موسموں میں اتنے دنوں بعد کچھ تبدیلی ہوئی ہو جیسا کہ دکن والوں کا بیان ہے کہ پہلے اس ملک کے موسموں کا اعتدال موجودہ حالت سے بھی بہتر تھا۔ ۱۲

پھر باشندگانِ ہند کے ساتھ اس عہد کے مسلمانوں کو جو عام علمی عقیدت تھی جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے تحفۃ الالباب کے مصنف نے بھی ان الفاظ سے ظاہر کیا ہے کہ:۔

"ہندوستان کے لوگ حکمت (فلسفہ) اور طب، ہندسہ اور مختلف دستکاریوں کے جو عجیب ہیں سب سے زیادہ جاننے والے ہیں

قلقشندی نے خود "مسالک الابصار" کے مصنف کے حوالے سے ہندوستان کے متعلق یہ الفاظ نقل کئے ہیں:۔

"ہندوستان کے متعلق میں طرح طرح کی باتیں سنا کرتا تھا جن سے میرے کان اور میری آنکھیں بھر گئی تھیں لیکن فاصلہ کی دوری کی وجہ سے اصل حقیقت کا پتہ نہ چلتا تھا لیکن جب لوگوں سے میں نے پوچھ گچھ شروع کی اور واقعات کی تحقیق کے درپے ہوا تو حقیقت یہ ہے کہ میں نے جو کچھ ہندوستان کے متعلق سنا تھا اس سے اسکو کہیں زیادہ پایا۔ میں اس ملک کو جو کچھ خیال کرتا تھا معلوم ہوا کہ وہ تو اس سے کہیں زیادہ بہتر اور برتر ہے۔" آخر میں اپنی رائے ان الفاظ میں قلم بند کرتا ہے:۔

"ہندوستان کیا ہے؟ تمہارے لئے اتنی بات سمجھنی کافی ہے کہ یہی وہ ملک ہے جس کے دریا میں موتی ہے خشکی میں سونا ہے۔ پہاڑوں میں اس کے یاقوت اور الماس ہے۔ اس کے جزائر میں کافور اور عود ہے، اسکے شہروں میں بادشاہوں (راجوں مہاراجوں)

کی گدیاں اور تخت ہیں۔ اس کے جنگلوں میں ہاتھی اور گینڈے
ہیں، اسی ملک کے لوہے سے تلواریں بنتی ہیں، اس ملک کی ہر
چیز ارزاں ہے (یہاں کی حکومتوں) کی فوج بے شمار اور ان
کے علاقے ان گنت، باشندوں میں عقل اور دانش کا زور
ہے۔ ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس کے رہنے والے
اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنے میں نظیر نہیں رکھتے اور یہی
چیز تو آدمی کو خدا سے نزدیک کرتی ہے"

(صبح الاعشیٰ قلقشندی ص ۶۲ ج ۵)

جیسا کہ میں نے عرض کیا، ان مسلمان سیاحوں کو حالانکہ اس ملک میں گھومنے پھرنے کا بہت کم موقعہ مل سکا ہے لیکن یہاں کی ہر ہر چیز پر ان کی نظریں پڑتی تھیں اور ان حالات میں بھی انہوں نے ایسی صحیح معلومات اس ملک کے متعلق فراہم کی تھیں جنہیں سن کر دوسروں کو نہیں ہم لوگوں کو جو ہندوستان کے باشندے ہیں حیرت ہوتی ہے، مثلاً ان ہی شیخ مبارک الانباری کے حوالے سے ہندوستان کی زرعی پیداواروں کی تفصیل قلقشندی نے بایں الفاظ نقل کی ہے۔

"اس ملک میں چاول ہی صرف اکیس قسموں کا پیدا ہوتا ہے
چاول کے سوا گیہوں، جو، مسور، ماش، لوبیا، تل وغیرہ ہر قسم کے
غلے یہاں ہوتے ہیں" (ایضاً)

میں تو نہیں جانتا کہ آج بھی کوئی ہندوستانی چاول کے متعلق یہ جانتا ہو گا کہ

اسکی اکیس ۲۱ قسمیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم لوگوں کو جو کچھ بھی معلوم ہے وہ یہی ہے کہ متعدد قسم کے چاول یہاں پیدا ہوتے ہیں۔"

اسی طرح ہندوستانی گنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کرنے کے بعد کہ:۔

"اس ملک میں گنے بڑی کثیر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں جن میں ایک قسم گنے کی ایسی ہوتی ہے جس کا رنگ اوپر سے کچھ سیاہ مائل ہوتا ہے۔ چوسنے کے کام کے لئے یہ گنے خوب ہیں ہندوستان کے سوا اور کہیں نہیں ہوتے۔"

پھر گنوں کے رس کا اور اس کے رس سے جو چیزیں بنائی جاتی ہیں ان کی تفصیل کو اس پر ختم کیا ہے کہ:۔

"مٹھائیاں اس ملک میں ۵۰ قسم کی بنتی ہیں"۔

بتائیے ہم نے اور آپ نے اپنے ملک کی ان مٹھائیوں کو کبھی شمار کیا ہے؟ پھلوں کے تذکرے میں یہ لکھا ہے کہ:۔

"اس ملک میں شیریں، ترش، کسیلے ہر قسم کے پھل اور میوے ہوتے ہیں"

آم کی دلچسپ تعریف

پھر بہت سے ہندوستانی اثمار کو گناتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ:۔

اس ملک میں بکثرت ایسے میوے پائے جاتے ہیں جو نہ شام میں میسر آتے ہیں اور نہ مصر میں"

اور اسی کے سلسلہ میں ہندوستان کے اس عجیب و غریب میوے کا بھی ان لوگوں نے تلفظ کی مختلف شکلوں کے ساتھ ذکر کیا ہے جو کہنے میں تو ایک پھل ہے لیکن رنگ روپ، شکل و صورت، مقدار کے کبر و صغر، مختلف قسم کی خوشبو اور آخر میں لپنے لامحدود ذائقوں کے تفاوت کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانیوں کو ایک میوہ نہیں بلکہ سینکڑوں میوے اس کے قالب میں عطا کیے گئے ہیں، میری مراد "آم" سے ہے۔ ان سارے سیاحوں نے اس "آم" کا تذکرہ کیا ہے۔ کوئی تو اس کا نام لے کر کہتا ہے :۔

ولهم فاكهة تشبه الخوخ يسمونها	ہندوستان والوں کے پاس ایک پھل ہے
الانبج تقارب الخوخ	جو شفتالو جیسا ہوتا ہے نام اس کا انبج ہے
(ابن حوقل ص ٣٢٨)	شفتالو کے برابر قریب قریب ہوتا ہے

یہ ابن حوقل کا بیان ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیچارے نے آم کے متعلق صرف کسی سے سن لیا ہے کہ اس کا مزہ شفتالو جیسا ہوتا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ صرف سندھ تک پہنچا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں سندھ میں آم نہیں ہوتے یا ہوتے ہوں گے تو وہ شفتالو سے زیادہ اپنے اندر کوئی کیفیت نہ رکھتے ہوں، لیکن دلچسپ تلفظ "آم" کا قلقشندی نے درج کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

وبها فواكه اخرى لا تعهد	اس میں اور بھی طرح طرح کے میوے ہیں
مثلها بمصر والشام كالعنبه	ایسے میوے شام و مصر میں نہیں پائے
وغيرها (صبح الاعشیٰ ص ٨٢ ج ٥)	جاتے مثلاً عنبا یا اسکے اور دوسرے پھل

گویا ان کے خیال میں آم عنب (انگور) جیسا کوئی میوہ ہے لیکن جیسا کہ

میں نے عرض کیا آم شفتالو بھی ہے اور انگور بھی اور وہ سب کچھ ہے جسے دنیا میں لوگ فواکہ اور اثمار میں شمار کرتے ہیں۔ گویا اس کی مثال اس عربی شعر کی ہے۔ جو کسی نے کہا ہے :۔

لیس علے اللہ لمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

(ترجمہ) خدا کیلئے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ ایک ہی چیز میں سارے عالم کی خوبیوں کو جمع کر دے

لہ آم کی تعریف میں مرزا بیدل عظیم آبادی کی اس مشہور رباعی میں بھی کچھ اسی قسم کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ رباعی

تا انبہ نمو بہ باغ آثار آورد
اسرار قدم جملہ باظہار آورد

اصل و فرعش بجز حقیقت ننمود
سو لاگل کرد و انبیا بار آورد

مطلب یہ ہے کہ "انبہ" کا عالم آثار کے باغ میں جب ظہور ہوا تو ازل کے سارے اسرار اسکے ذریعے سے دنیا میں ظاہر ہو گئے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ (ازل کے حقیقی اسرار دو ہی ہیں خدا اور خدا کے انبیاء) اب دیکھو! آم کے پھول کو لوگ مولر کہتے ہیں (آج کل یو۔پی میں بعض علاقوں میں مور بہار میں منجر کہتے ہیں) پس آم کا پھول تو مولا ٹھہرا اور پھل اپنی ابتدائی حالت میں انبیاء کہلاتا ہے۔ گویا ازل کے ان دونوں اسرار پھول پھل آم کے مشتمل ہیں۔ ایک اور عظیم آبادی شاعر نے اردو میں آم ہی کو داد ان الفاظ میں دی ہے :۔

انبت اللہ نباتاً حسناً کا منکر
نہیں کافر ہے تو پھر کس کو کہیں ہم کافر

انبیاء سے نہیں بہتر ہے اگر کوئی ثمر
ہے پھلوں پر یونہی انبہ کی فضیلت ظاہر

ایک دلچسپ لطیفہ اس سلسلے میں یہ بھی ہے کہ قرآن میں اپنی نعمتوں کو جتلاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ بنی آدم کو فاکھۃ وابّا دیے گئے ہیں۔ فاکہہ کے معنے تو میوے کے ہیں لیکن ابّا کا

(باقی اگلے صفحہ پر)

الغرض اسی طرح ہندوستان کی ترکاریوں اور یہاں کی بھاجیوں تک کے نام ان لوگوں نے گنوائے ہیں۔ ہندوستان میں خاص خاص طرح کے جو پھول ہوتے ہیں ان کی بھی ایک حد تک ان لوگوں نے فہرست دی ہے۔

ہندوستان میں سواری کے جانور

بلکہ اسی سلسلے میں "ہندوستان" کے حیوانات" کا عنوان قائم کر کے ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ:۔

باقی پچھلا لفظ قرآن میں جو آیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ عجیب بات ہے کہ خلیفہ اوّل حضرت صدیقؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب پوچھا گیا تو آپ نے اس کے جواب میں وہ مشہور فقرہ فرمایا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ مجھے کونسی زمین اٹھائیگی اور کونسا آسمان اپنا سایہ مجھپر ڈالے گا اگر خدا کی کتاب کے متعلق میں ایسی بات کہوں جسے میں نہیں جانتا" یعنی آپ نے اس لفظ کے معنی سے لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ پھر حضرت عمرؓ سے بھی اسی قسم کی روایت آئی ہے یعنی آپ نے بھی فرمایا ہے کہ مجھے اس لفظ کے معنے معلوم نہیں ہیں۔ اگرچہ باوجود ان آثار کے متاخرین مفسرین نے اس کا ترجمہ گھاس چارہ" کر دیا ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ جب مفسرین نے صدیقی و فاروقی آثار کے باوجود مطلب بیان کرنے کی جرأت کی ہے تو فاکہہ کے قرینے سے آدمی کا ذہن اگر "اَبّ" کے لفظ سے "انب" کی طرف منتقل ہو جائے جو آم کا قدیم ہندی تلفظ ہے۔ ایرانیوں میں "انبہ" کی شکل میں یہ لفظ مروج ہوا۔ اگر عرب میں وہی "انب" "اَبّ" ہو گیا تو کیا تعجب ہے۔ خصوصاً جب ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یمن کے ساحلی شہروں میں "انب" کے درخت پائے جاتے ہیں ۱۲

"گو ہندوستان میں خچر اور گدھے بھی ہوتے ہیں لیکن عموماً
یہاں لوگ نہ خچروں ہی پر چڑھنا پسند کرتے ہیں اور نہ گدھوں
پر، بلکہ گدھوں کی سواری ہندوستان میں بہت معیوب اور
ذلت کی بات سمجھی جاتی ہے۔ عموماً سواری گھوڑوں پر اور
بیل کی مروج ہے۔" (صبح الاعشیٰ ص۸۳ ج ۵)

اس سلسلہ میں عموماً ہاتھی کی سواری کا ذکر خصوصیت سے کرتے ہیں، بلکہ بعض باتیں اس موقعہ پر ان لوگوں نے ایسی لکھی ہیں جن سے عام طور پر ہم ہندوستانی لوگ شاید ہی واقف ہوں۔ مثلاً ابن خرداذبہ نے لکھا ہے کہ:۔

"ہندوستان کے راجوں اور مہاراجوں میں اس کا بہت شوق
ہے کہ ان کا ہاتھی جتنا اونچا ہو بہتر ہے اور ہاتھیوں کی کمی
بیشی کا مدار زیادہ تر اس کی بلندی اور پستی ہی پر ہے۔"

اس کے بعد اس خاص بات کا ذکر کرتا ہے کہ:۔

"اچھے سے اونچے ہاتھی کا قد نو ہاتھ سے زیادہ نہیں ہوتا البتہ
اغباب (سیلون کے جنگل کو کہتے ہیں) کی ہتھنی دس ہاتھ کبھی
گیارہ ہاتھ تک اونچی ہوتی ہے۔" (ابن خرداذبہ ص۶۶)

ایک ہاتھی کے دلچسپ واقعات

ہاتھی کے تذکرے میں بعض دلچسپ واقعات کا بھی ان لوگوں نے تذکرہ لیا ہے۔ مثلاً بزرگ بن شہریار نے یہ روایت درج کی ہے کہ:۔

"بعض لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ہندوستان کے ایک شہر میں اس نے ایک ہاتھی کو دیکھا تھا جو اپنے مالک کی تمام ضرورتوں کو انجام دیا کرتا تھا، اس کا مالک روزانہ اُس زنبیل کو ہاتھی کے حوالے کر دیا کرتا تھا جس میں بازار سے ضرورت کی چیزیں آتی تھیں۔ اُسی زنبیل میں وہ کوڑیاں رکھدیتا تھا کہ ان لوگوں کے یہاں بطور سکے کے کوڑیوں ہی کا رواج ہے، اور کوڑیوں کے ساتھ ان چیزوں کے نمونے بھی اسی تھیلی میں رکھدیے جاتے تھے جن کا منگوانا مقصود ہوتا۔ خواہ وہ کچھ ہو ہاتھی اس زنبیل کو لیکر بنئے کی دکان پر آتا۔ بنیا ہاتھی کو دیکھتے ہی اپنے سارے کاروبار چھوڑ کر ہاتھی کے پاس آجاتا کسی قسم کی کوئی ضرورت ہو کسی قسم کا گاہک بنئے کے سر پر کھڑا کیوں نہ ہو لیکن اُس وقت ہاتھی کے سوا کسی کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور زنبیل کو اس سے لیکر کوڑیوں کو گنتا اور ان نمونوں کو دیکھ لیتا۔ پھر اسکی دکان میں بہتر سے بہتر چیز اُن نمونوں کی جو ہوتی انہیں زنبیل میں رکھدیتا اور اسکا خیال رکھتا کہ کم بھاؤ میں چیزیں ہاتھی کی زنبیل میں رکھی جائیں۔ اور ہاتھی اگر کچھ اضافہ پر اصرار کرتا تو چپکے سے اس اضافہ کو بھی زنبیل کے سپرد کر دینا ضروری خیال کرتا تھا۔ کبھی بنیا کوڑیوں کے گننے میں اگر غلطی کرتا تو ہاتھی اپنی سونڈ سے

گڑبڑ مچانے لگتا۔ مجبوراً کوڑیوں کو بنیا پھر گنتا اور ہاتھی چیز لیا
کو لیکر اپنے مالک کے گھر واپس ہوتا۔ اگر اتفاق سے ہاتھی
کی لائی ہوئی چیز کو مالک کچھ کم خیال کرتا تو ہاتھی کے چند
دھول رسید کرتا ہے چارہ ہاتھی اسی وقت بنئے کی دکان
کی طرف واپس لوٹ کر سونڈ سے اسکی دکان کی چیز کو بکھیرنے
اور اُلٹ پلٹ کرنے لگتا۔ بنئے کے لئے اسکے سوا کوئی
چارہ نہ تھا کہ یا تو حسبِ مرضی چیز کا اضافہ کرے یا اسکی
کوڑیاں گن کر واپس کر دے۔

اس ہاتھی میں یہ کمالات بھی تھے کہ وہ مالک کے گھر میں جھاڑو
بھی دیتا۔ پانی چھڑکتا۔ اور چاول بھی کوٹتا یعنی سونڈ میں موسل
کو لیکر چاول پر ضرب لگاتا۔ ایک آدمی اس کے سامنے
دھان کو جمع کرتا جاتا اور وہ اس کو کوٹتا جاتا تھا۔ اسی
ہاتھی پر پانی بھی اس کا مالک منگوایا کرتا تھا۔ جسکی صورت
یہ ہوتی کہ اپنی سونڈ میں ڈول رسی کے ساتھ ہاتھی لے جاتا
اور کنوئیں سے بھر کر مالک کے گھر پانی پہونچاتا۔ الغرض اسی
طرح اپنے مالک کی تمام ضرورتیں یہی ہاتھی پوری کیا کرتا تھا
اور علاوہ اس کے جب سواری کی ضرورت ہوتی تو اس کا
مالک اس کام کو بھی اس سے لیا کرتا تھا۔ دور دراز مقامات
کا سفر اس پر کیا کرتا تھا۔ ہاتھی خود اپنے لئے چارہ اس طرح لاتا کہ

بچہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا اور اس کو لے کر ہاتھی جنگل چلا جاتا سونڈ سے جنگل کی گھاس اکھاڑ کر درختوں کے پتے توڑ توڑ کر اس بچے کے حوالے کرتا وہ اسکو اس کی پیٹھ پر جمع کرتا۔ یہی گھاس اور پتے اس ہاتھی کی خوراک تھی"۔

اسی راوی کا بیان ہے کہ:۔

"اس قسم کے سدھائے ہوئے ہاتھیوں کی قیمت دس دس ہزار درم تک ہوتی ہے"۔ (بزرگ بن شہریار ص۱۰۵)

ہندوستان کے جنگی ہاتھی

سندھ میں جب مسلمان پہنچے تو ہندوستان کے اس عجیب وغریب جانور سے انہیں بھی کافی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ المسعودی نے "سندی فیل" کا تذکرہ کرتے ہوئے اور یہ کہ ہندوستان میں جنگ کا ایک اہم عنصر ہاتھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ:۔

"جنگی ہاتھی لوہے میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اسکو زرہ پہنائی جاتی ہے اور سونڈ میں اس کے ترطل (کٹار) ہوتی ہے جو ایک قسم کی ہندوستانی تلوار ہے۔ پانچ پانچ سو آدمی چاروں طرف سے اس ہاتھی کو گھیرے رہتے ہیں جو اسکی حفاظت کرتے ہیں۔ اور اس کو روک روک کر آگے بڑھاتے ہیں"۔

اس کے بعد اس نے سندھ کے مشہور شہر منصورہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"منصورہ" منصور بن جمہور کے نام پر موسوم ہے جو بنی امیہ کی طرف سے سندھ کا گورنر تھا۔ اسی منصورہ کا جو آج کل بادشاہ ہے اُس کے پاس ایک جنگی ہاتھی ہے اور اسّی ہاتھی ہیں۔"

آخر میں اس نے بیان کیا ہے کہ:-

"اسی سندھی بادشاہ کے دو ہاتھیوں کو میں نے بھی دیکھا ہے جو بہت بڑے تھے، اُن کی سندھ و ہند کے راجواڑوں میں بڑی شہرت تھی کیونکہ یہ دونوں ہاتھی بڑے بہادر، دلیر اور آگے بڑھ کر حملہ کرنے کی خاص مشق رکھتے تھے، ان میں سے ایک ہاتھی کا نام منفرقلس اور دوسرے کا نام حیدرہ تھا"

المسعودی نے اسکے بعد یہ عجیب روایت درج کی ہے کہ:-

"اول الذکر یعنی منفرقلس کے متعلق عجیب عجیب خبریں مشہور ہیں۔ اس ملک میں بھی اور یہاں سے باہر بھی جن میں ایک خبر تو یہ ہے کہ اسکا فیلبان (مہاوت) مر گیا تو چند دن تک منفرقلس نہ کچھ کھاتا تھا اور نہ پیتا تھا۔ اور جیسے کوئی رنجیدہ و غمگین اس طرح رونے کی آواز نکالتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غم رسیدہ آدمی رو رہا ہے۔ اس ہاتھی کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔

اسی طرح دوسری خبر اسی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ایک دن فیلبان نے

سے (جائزہ دینے کیلئے) سب شاہی ہاتھی نکلنے لگے۔ آگے آگے سب کے
منعر فلس تھا اسکے پیچھے حیدرہ اور حیدرہ کے پیچھے دوسرے ہاتھی
ہاتھی قطار باندھے یوں ہی سب جا رہے تھے۔ راستے
میں ان کی گذر ایک کم چوڑی گلی میں ہوئی۔ ادھر سے ایک بیچاری
عورت چلی آرہی تھی۔ ہاتھی کو دیکھکر اس پر جو خوف طاری ہوا
بدحواس ہوکر گر پڑی اور اسکی ساڑی بدن سے الگ ہوگئی۔ کہتے
ہیں کہ منعر فلس عورت کے اس حال کو دیکھکر فوراً وہیں ٹھٹک
کر کھڑا ہوگیا۔ بلکہ مڑ کر اس نے گلی کے عرض کو روک کر کچھ
ایسی صورت اختیار کی کہ دوسرے ہاتھی اب آگے نہیں جا
سکتے تھے۔ اور سونڈ سے منعر فلس اس عورت کو اشارہ
کرنے لگا کہ اٹھ کر ساڑی کو اپنے بدن پر ڈال لے اور اسکے جسم
کا جو حصہ کھل گیا ہے اُسے ڈھانک لے۔ عورت بیچاری اٹھی
اور کپڑے درست کر کے جب وہ نکل گئی تب پھر گلی کی سیدھ
کی طرف رُخ کر کے منعر فلس آگے بڑھا۔ اور دوسرے ہاتھی اس
کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

المسعودی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:-

"جنگ کے سوا ہاتھی سواری کا کام بھی دیتے ہیں اور گاڑی بھی
ہندوستان میں کھینچتے ہیں۔ بلکہ کسونہ کر بیلوں سے جیسے دھان
نکلوائے جاتے ہیں ہاتھیوں سے بھی ہندوستان میں یہ کام لیا جاتا ہے"

اس نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ:۔

"حبشہ میں حالانکہ ہاتھی ہندوستان سے بہت زیادہ ہیں
لیکن وہاں کے لوگوں نے انہیں سدھایا نہیں ہے سب وحشی ہیں۔"

(المسعودی ص۲۴۶)

ہندوستانی حکمرانوں کی معاشرت

اسی طرح ان سیاحوں نے ان حکمرانوں کا جو اُس زمانہ میں ہندوستان پر حکومت کرتے تھے ان کے خصوصی عادات و اطوار کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے سلیمان نے لکھا ہے کہ:۔

"ہندوستان کے راجگان و مہاراجگان عموماً کانوں میں ایسی سونے کی بالیاں پہنتے ہیں جن میں قیمتی جواہرات جڑے ہوتے ہیں اور اپنے گلوں میں سبز سُرخ جواہرات کے ہار ڈال لیتے ہیں جن میں موتی بھی جگمگاتے رہتے ہیں اور یہی چیزیں ان لوگوں کے خزانوں کے بہترین سرمایے ہیں۔ ان کے فوجی سرداروں اور کشوری حکام و عہدہ داروں میں اس قسم کے زیورات کا عام مذاق پایا جاتا ہے۔" (سلیمان ص۱۴۵)

کہاروں پر سوار ہونے کا عام طریقہ جو اب بھی ہندوستان میں مروج ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ان لوگوں نے بیان کیا ہے کہ:۔

"اس ملک کے راجوں مہاراجوں اور دوسرے ارباب ثروت و دولت

کا قاعدہ ہے کہ ایک قسم کی خاص سواری پر سوار ہوتے ہیں جسے الھندول (یعنی ہنڈول) کہتے ہیں۔ گویا وہ محفہ کی جیسی ایک چیز ہوتی ہے۔ گویا سمجھنا چاہیئے کہ (بجائے اونٹوں کے) آدمیوں کے کندھوں پر محفہ جا رہا ہے۔ ان سواریوں کے اندر ایک خاص قسم کا طلائی ظرف (پاندان) ہوتا ہے جسے کرندہ کہتے ہیں۔ اس میں ورق التنبول (پان) ہوتا ہے اور دوسری ضرورت کی چیزیں یا دوسرے لوگ سروں پر اٹھائے ہوئے سواری کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ راجہ شہر میں اسی طریقہ سے گھومتا ہے اور پان چبایا جاتا ہے اور اس کے سامنے ایک اور برتن مسمفد (اگالدان) ہوتا ہے، اسی میں پیک ڈالتا جاتا ہے۔" (عجائب الہند ص۱۱۸)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج سے سینکڑوں برس پہلے کی ہندی معاشرت کا کتنی گہری نظروں سے ان لوگوں نے مطالعہ کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ ان مسلمانوں کی دل چسپیوں کا حال کیا تھا۔

پیشہ ور عورتوں کا رواج

سلیمان تاجر کے حوالہ سے میں اوپر نقل کر چکا ہوں کہ ہندوستان میں زنا کی سزا قتل تھی۔ مرد عورت دونوں کی رضامندی سے فعل اگر صادر

ہوتا تو دونوں ختم کر دیے جاتے تھے اور اگر یہ ثابت ہوتا کہ عورت کے ساتھ جبر و زبردستی کی گئی ہے تو صرف مرد ہی قتل ہوتا تھا۔ مگر ان ہی مورخین کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کسبیوں اور پیشہ ور عورتوں کا طبقہ ان کے زمانے میں بھی موجود تھا چنانچہ ابوزید السیرافی نے ہندوستانی رواسم اور یہاں کے حالات کے تذکرہ میں جہاں سراؤں کا تذکرہ کیا ہے اُسی میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ:۔

"ان سراؤں میں باضابطہ پیشہ کرانے والی عورتیں بھی رہتی ہیں جن سے آنے جانے والے لوگ اپنا منہ کالا کرتے ہیں"[1]

نہیں کہا جاسکتا کہ اس قسم کی باتوں کا رواج اس ملک میں کب سے ہوا۔ کیونکہ ہندوستانی معاشرت کے متعلق قدیم ادبیات کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی عفت و ناموس کا سب سے بڑا محافظ

---

[1] مسلمان مورخین سے زیادہ شدید ترین تھا خوش عقیدگی رکھنے والی ہیں تو نہیں خیال کرتا کہ دوسری قوم کے ارباب تاریخ میں کوئی جماعت ہوگی۔ خوش اعتقادی کی حد یہ ہے کہ مسالک الابصار کے مصنف نے فول جو بیم کے بیج کی طرح ایک ترکاری ہے۔ مصر میں اور اب تو عرب میں بکثرت اس کا رواج بڑھ گیا ہے اس فول کا ذکر کرکے اسی مسلمان مورخ نے لکھا ہے کہ ہند میں فول نہیں پایا جاتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہندوستان والے حکما ہیں فول اُن کے نزدیک شاید ایسی ترکاری ہے جس سے آدمی کا عقلی جوہر بگڑ جاتا ہے۔ (صبح الاعشیٰ ج ۵ صفحہ ۸۲) یہی مجھے کہنا ہے کہ ہندوستان کے باب میں اتنے خوش اعتقاد مورخوں کے بیانوں پر اعتماد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ بھلا مجوں کے ساتھ جن برائیوں کا مشاہدہ اس ملک میں انہوں نے کیا ہے بیان کر دیا ہے۔ ۱۲

یعنی حجاب اور پردہ کا قانون تھا جو اس ملک میں عام طور پر مروّج تھا۔

قدیم ہندوستان میں پردہ کا دستور

رامائن اور مہابھارت میں جو قصے مذکور ہیں۔ ان قصوں کے پڑھنے والوں کو قدم قدم پر ایسی چیزیں ملتی ہیں جن سے ان کی تصدیق ہوتی ہے کہ قدیم ہندوستانی معاشرت میں پردہ اور حجاب ایک بڑا اہم عنصر تھا رامائن میں ہے کہ جس وقت بن باس ہونے کے ارادے سے سری رام چندر جی مہاراج سیتا کے ساتھ گھر سے نکلے تو لوگوں نے شور مچایا کہ

"کیا بُرا وقت ہے کہ وہ سیتا رانی جن کو کبھی آسمانی دیوتا بھی نہ دیکھ پاتے تھے آج بازاری لوگ اُس کو دیکھتے ہیں"

(رامائن ایودھیا کانڈم سرگ ۳۳ صفحہ ۱۹۷)

پھر جب لنکا فتح کر کے سیتا جی کو راون کی قید سے چھڑا کر رامچندر جی لے آئے تو بالمیکی نے لکھا ہے کہ: جب وبھیشن کو سری رامچندر جی نے حکم دیا کہ نہلا دھلا کر سیتا کو لاؤ۔ وبھیشن سیتا جی کو پالکی میں سوار کر کے لایا اور مہاراج کو اطلاع دی۔ حکم ملا کہ ہمارے سامنے پیش کرو۔ وبھیشن نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اردگرد کے لوگوں کو ہٹ جانے کا حکم دیا۔ تاکہ پردہ ہو جائے۔ لوگوں کے ہٹنے میں شور و غل ہوا۔ رامچندر جی نے نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ ہمارے حکم کے بغیر لوگوں کو کیوں ہٹایا گیا۔ اس کے بعد وبھیشن کو ویدک دھرم کے اس قانون سے مطلع کیا کہ:-

"سنگرام کے موقع پر مصیبتوں میں لڑائیوں میں سوئمبر کے وقت اور قربانیوں میں اور بیاہ میں عورت کا سامنے آجانا اور بیوی کا نگاہ کا پڑ جانا گناہ نہیں ہے۔ سیتا بھی مصیبت میں ہے۔ مجبوریوں میں گرفتار ہے۔ اس کے سامنے آنے میں کوئی حرج نہیں۔ خاص کر جب کہ میں موجود ہوں۔"

(راماین یدھ کانڈ سرگ ۱۱۴ صفحہ ۹۴۲)

سیتا جی کو پالکی سے اتار کر دی پیش جب رام مہاراج کے حضور میں لے چلے تو سیتا رانی بے پردگی کی شرم سے دہری ہوئی جاتی تھیں گویا اپنے آپ کو اپنے بدن ہی کے اندر چھپاتی تھیں (یدھ کانڈ سرگ صفحہ ۱۱۴)

الغرض مردوں کی سوسائٹی کا عورتوں کی سوسائٹی سے جدا رہنا، جو قانون حجاب کی روح ہے ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ہم راماین کے اسوہ حسنہ میں شمار کر سکتے ہیں۔ راجہ جنک کے متعلق لکھا ہے کہ رامچندر کی والدہ کوشلیا سے ایک دفعہ گفتگو کرنے کی ضرورت ان کو پیش آئی تو براہ راست گفتگو نہیں کی۔ بلکہ دربان کی معرفت گفتگو ہوئی۔ (اتر رام چرتر بھوم انکم ۴)

لچھمن جی مہاراج کی سب سے بڑی تعریف یہ کی گئی ہے کہ بن باس کے زمانہ میں شب و روز سیتا جی کے ساتھ رہے لیکن لچھمن جی کہتے تھے کہ میں نے سیتا جی کے صرف پاؤں دیکھے ہیں۔ اسی طرح راجہ سگریو یعنی بندروں کا راجہ جب کہا جاتا ہے اسکے متعلق لکھا ہے کہ ڈر کے مارے بجائے اپنے اپنی رانی کو لچھمن جی سے بات کرنے کے لئے بھیج دیا لیکن عورت کو دیکھ کر لچھمن جی نے منہ پھیر لیا۔

اور گردن نیچی کرلی۔ (رامائن کشن کانڈم سرگ ۳۳) اسی بنیاد پہ لگی تعریف ہو لی کہ غیر عورت پر انہوں نے نظر نہ کی۔ رامائن ہی میں ہے کہ رام مہاراج کے اندرونی دروازے پر بڑھیا عورتوں کا پہرہ رہتا تھا (رامائن ایودھیا کانڈم سرگ ۱۰ اشلوک ۳) اب مہابھارت کا مطالعہ کیجئے۔ دروپدی کو جب پانڈو ہار گئے اور دریودھن نے دروپدی کو بھرے دربار پکڑ کر بلوایا تو اس وقت دروپدی نے تقریر کی "اے بزرگو! راجاؤں نے مجھے سوئمبر کے موقع پہ دیکھا تھا اس سے پہلے مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور سورج بھی مجھے نہ دیکھ پاتا تھا۔ آج بدقسمتی سے مجھے غیر مردوں کے سامنے آنا پڑا اور اجنبی لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں اس سے بڑھکر اور کیا ذلت ہوگی کہ مجھ جیسی پاکدامن خاتون کو لوگوں کے سامنے آنا پڑا۔ ہزار افسوس ہے کہ راجاؤں کی دھرم کو کھو بیٹھے ہم تو سنتے آئے ہیں کہ قدیم شرفا کبھی بھی اپنی منکوحہ بیوی کو مجمع میں نہ لیجاتے تھے افسوس کہ اس خاندان کا دھرم جاتا رہا۔ (مہابھارت سبھا پرب ادھیا ۶۹ صفحہ ۹۱)

اسی مہابھارت میں ہے کہ سری کرشن کے ماموں کنس راجہ متھرا نے کشتی کا دنگل جب قائم کیا تو مستورات کے لئے جو خاص مقام تماشہ دیکھنے کیلئے بنوائے گئے تھے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بلندی میں اٹھے ہوئے راج ہنس جیسے دکھائی دیتے تھے جن میں باریک جالی تماشہ دیکھنے کیلئے لگائی گئی تھی (وشنو پروہ ادھیا ۱۹)

بہر حال منوجی تک کا یہ حکم جب ہندو مذہب میں موجود ہے کہ مرد تنہائی میں ماں بہن بیٹی کے ساتھ نہ بیٹھے وجہ یہ بتائی ہے کہ شہوت سے آدمی مغلوب

ہو جاتا ہے لکھے پڑھے لوگ بھی پھسل پڑتے ہیں۔ (ادھیا ۲ صـ ۶۹)

نواب اس کے بعد قانونِ حجاب کیلئے ویدک دھرم میں اور کیا چاہیئے تھا۔ کل جگ کی علامتوں کو بتلاتے ہوئے برہما پران میں ہے کہ آخری زمانہ میں عورتیں بگڑ جائیں گی۔ بے پردہ دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سنواریں گی کسی کی کچھ پروانہ کریں گی (شلوک ۳۹۔ ادھیا ۲ صـ ۱۲۲)

ہرش جرتیم میں بان نے لکھا ہے کہ جب سے شریف اور خاندانی عورتوں کے منہ پر نقاب کی جالی نہیں رہی ان کی شرم وحیا جاتی رہی ہے (ہرش اچھواس ۴)

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بہت سے قدیم اصول پھر بہ تدریج ایام انحطاط میں زوال آیا اسی کا شکار پردہ کا قانون بھی ہندوستان میں ہوا سلیمان تاجر جس زمانہ میں ہندوستان آیا وہ اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں قلم بند کرتا ہے کہ۔

اس ملک کے اکثر راجہ اپنی رانیوں کو باہر نکالتے ہیں اور ان سے ملنے کے لئے جو لوگ آتے ہیں ان کے سامنا اپنی رانیوں کو بھی لاتے ہیں۔ خواہ یہ ملنے والے خود ان کے ملک کے ہوں یا باہر کے ہوں۔ رانیاں دیکھنے والوں سے پردہ نہیں کرتیں (سلیمان ۱۴)

جوئے کا عام رواج اور اس کے حیرت انگیز واقعات

خیال تو کیجئے قمار یعنی جوا بھی کوئی ایسا فعل ہو سکتا ہے جس کی برائیوں تک پہونچنے کیلئے کچھ زیادہ غور وفکر کی ضرورت ہے لیکن یہی ہندوستان ہے

جبکہ فلاسفر و حکما کا ذکر اسلامی مورخین اتنی بلند آہنگیوں کیساتھ کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ:۔

"ان لوگوں میں نرد اور جوئے کا عام رواج ہے اور وسیع پیمانے پر یہ رواج ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ غریب اور مفلس لوگ بھی اس راہ میں اپنی مردانگی دکھاتے ہیں۔"

سراندیپ کے ذکر میں بھی لکھا ہے اور واللہ اعلم سراندیپ ہی تک یہ بات محدود تھی یا ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی اس کا رواج تھا یعنی لکھا ہے کہ:۔

"زیادہ تر یہ لوگ جوا مرغ کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ مرغ اس علاقہ میں بڑے بڑے فربہ اور موٹے ہوتے ہیں۔ جنکے پنجے اور چنگل بڑے لمبے لمبے اور تیز ہوتے ہیں۔"

اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"مرغوں کے چنگلوں میں یہ لوگ چھوٹی چھوٹی تیز چھریاں باندھ دیتے ہیں اور انہی سے وہ لڑتے ہیں۔ جو مرغ غالب آجاتا ہے اُسکی قیمت سونے کے سکے سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔"

آگے لکھا ہے کہ:۔

"جوئے میں داؤ پر سونا۔ چاندی، زمین مختلف قسم کے نباتات وغیرہ چیزیں لگائی جاتی ہیں۔"

اور دردناک قصہ ان لوگوں کا بیان ہے جو داؤ پر اپنی انگلیوں کو لگا دیا کرتے

تھے۔ ہارنے والے کی انگلیاں جیتنے والے اسی وقت پتھر پر رکھ کر کلہاڑی سے کاٹ دیتے تھے۔ سلیمان کا بیان ہے کہ:۔

"انگلیوں میں جوا کھیلنے والوں کے بازو میں برتن رکھا رہتا ہے جس میں ناریل یا تل کا تیل ہوتا ہے۔ کیونکہ زیتون کا تیل اس ملک میں نہیں پایا جاتا۔ تیل کا یہ ظرف آگ پر رکھا رہتا ہے بیچ میں کلہاڑی دھری ہوتی ہے۔ کلہاڑی کو خوب تیز کر لیتے ہیں پھر فریقین میں جو جیت جاتا ہے تو ہارنے والے کے ہاتھ کو پتھر پر رکھ کر کلہاڑی مار دیتے ہیں۔ انگلیاں اس ہارنے والے بیچارے کی اُسی وقت جُدا ہو جاتی ہیں وہ فوراً اپنے ہاتھ کو اسی کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیتا ہے جس سے خون بند ہو جاتا ہے عجیب تریات اس کے بعد یہ لکھی ہے کہ

ولا ينقطع ذلك عن المعاودة في اللعب (سلیمان ص ۱۲۵)

مگر جوئے کے کھیل سے یہ حادثہ بھی اس کو نہیں روکتا۔

سلیمان نے شاید اپنا یہ مشاہدہ ہی بیان کیا ہے کہ:۔

"بسا اوقات دونوں فریق اس حال میں جُدا ہوتے ہیں کہ دونوں کے ہاتھ انگلیوں سے خالی ہوتے ہیں۔" (سلیمان ص ۱۲۵)

ایک ترکیب خون کے بند کرنے کی یہ بھی لکھی ہے کہ:۔

"تیل میں تر کی ہوئی بتی کو جلا کر کٹے ہوئے مقام پر رکھ دیتے ہیں جس سے وہ مقام جل جاتا ہے۔ جلے ہوئے گوشت کی بدبو پھیلتی رہتی ہے لیکن اس حال میں بھی وہی جوا رہی جوا کھیلنے

میں مشغول رہتا ہے اور کسی قسم کا اضطراب یا پریشانی اس سے
ظاہر نہیں ہوتی۔" (سلیمان ص ۱۲۵)

ستی کی رسم

حیرت ہے کہ اس ہوش و حواس کے باوجود ہندوستان ستی اور خودکشی کے
رواج کو بند نہ کر سکا سلیمان وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ:۔
"ہندوستان کے راجوں کا قاعدہ ہے کہ جب مرتے ہیں تو
انکی رانیاں بھی اُن کے ساتھ جل جاتی ہیں۔ البتہ اگر انکی
کی خواہش نہ ہو تو اس حرکت سے رُک بھی سکتی ہیں۔"
واللہ اعلم سلیمان نے اس رسم کو ہندوستان کے راجوں تک کیوں
محدود بتایا ہے بعد کے سیاحوں نے اسکو ہندوستان کی عمومی رسم میں شمار
کیا ہے اور یوں بھی بند ہونے سے پہلے جیسا کہ سب جانتے ہیں عوام و خواص
سب ہی میں یہ رسم پائی جاتی تھی۔

خودکشی کا رواج

اور خودکشی کی یہ رسم کچھ زن و شوہر کے تعلقات ہی کے ساتھ وابستہ نہ تھی
بلکہ ان سیاحوں کا بیان ہے کہ اس کے سوا بھی دوسری صورتیں اس ملک میں
رواج پذیر تھیں۔ مثلاً سلیمان نے لکھا ہے کہ:۔
"بلھرا کے اور اسکے سوا دوسرے راجگانِ ہند کے ممالک میں بعد سنقور

ہے کہ لوگ اپنے آپ کو قصداً آگ میں جھونک کر جل جاتے ہیں"
سلیمان نے اس کی توجیہہ بھی کی ہے کہ:۔
"تناسخ کے اعتقاد نے ان کو اس فعل پر جری بنا دیا ہے۔ اس عقیدے پر ان کا ایمان ہے اور بغیر کسی تذبذب کے وہ اس پر یقین رکھتے ہیں"۔
آگے اسی سلسلہ میں اسی نے بیان کیا ہے کہ:۔
"ہندوستان کے بعض راجوں کا دستور ہے کہ جب وہ گدی نشین ہوتا ہے تو اُس کے لئے بھات پکایا جاتا ہے اور کیلے کے پتوں پر راجہ کے سامنے وہ بھات رکھا جاتا ہے۔ راجہ اپنے لوگوں میں سے بعض افراد کو بلاتا ہے جنکی تعداد تین سو چار سو کے قریب ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو راجہ مجبور نہیں کرتا بلکہ اپنے اختیار سے وہ راجہ کی اس دعوت میں شریک ہوتے ہیں۔ راجہ ان آنیوالوں کو اسی بھات سے خود کچھ کھالینے کے بعد عطا کرتا ہے۔ ایک ایک کر کے لوگ راجہ کے پاس آتے ہیں اور بھات کا جو حصّہ ان کو ملتا ہے اُس کو لیکر کھالیتے ہیں لیکن کھالینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ راجہ اگر مرجائے یا قتل ہوجائے تو اس شخص پر جس نے اس تقریب میں راجہ کے ہاتھ سے نوالہ لیکر کھایا ہے یہ واجب ہوجاتا ہے کہ ٹھیک اس دن جس دن راجہ کو موت آئے اپنے آپکو آگ میں جلا دے"۔

سلیمان نے اس کے بعد لکھا ہے کہ:-

"جب جلنے پر کوئی آمادہ ہوتا ہے تو راجہ کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوتا ہے اور جلنے کی اجازت حاصل کرتا ہے پھر بازاروں میں گھومتا ہے آگ کا الاؤ جو ڈکر اسکے لئے تیار کیا جاتا ہے جب بالکل عقیق کی طرح دہک کر آگ تیار ہو جاتی ہے تو اس جلنے والے کے آگے آگے سنکھ پھونکے جاتے ہیں، اور لوگ بازار میں اس کو گشت کراتے ہیں۔ اسکے گھر کے لوگ اہل وعیال سب چاروں طرف سے گھیرے رہتے ہیں۔ لوگ اس کے سر پر پھولوں کا تاج بھی پہناتے ہیں، آگ میں اشتعال پذیر چیزیں لوبان سندروس وغیرہ ڈالی جاتی ہیں، اسکے بعد یہ جلنے والا پھاند کر آگ میں کود پڑتا ہے۔ اور چند ہی لمحوں میں بھسم ہو کر رہ جاتا ہے"

خود تو سلیمان نے نہیں دیکھا تھا لیکن دیکھنے والے کی زبانی ایک واقعہ اسی سلسلہ کا اس نے نقل کیا ہے۔ کہ:-

"ان ہی جلنے والوں میں سے ایک آدمی کو میں نے دیکھا کہ جب وہ آگ میں کودنے پر آمادہ ہوا تو خنجر جو اسکے ہاتھ میں تھا۔ اسکی نوک کو اسنے اپنے دل پر رکھا اور اسکے بعد دل کے پاس سے پیڑو تک چاک کر دیا۔ پھر اپنے بائیں ہاتھ کو اس نے سینہ میں داخل کیا اور اپنے جگر کا جتنا حصہ نوچ کر نکال سکا اپنے ہاتھ سے اس نے نکالا۔ اس وقت وہ باتیں بھی کرتا جاتا تھا پھر

اسی خنجر سے جگر کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اس نے اپنے بھائی کے حوالے کیا۔ گویا موت اس کی نگاہ میں کتنی حقیر شے ہے، اسکو ان افعال سے ظاہر کر رہا تھا۔ پھر آگ میں پھاند گیا (سلیمان ص ۱۱)

اور سچ تو یہ ہے کہ ستی کی رسم ہو یا خودکشی کی مذکورہ بالا رسم اس پر کم از کم اس یورپ کو تو ہنسنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جس نے زیادہ دن نہیں گذرے ہیں کہ ڈوئل کی رسم کو غیر قانونی قرار دینے کی جسارت دکھائی ہے۔

اس کے بعد سلیمان نے (اسی راوی سے جسنے مذکورہ بالا واقعہ اس سے بیان کیا تھا) یہ روایت درج کی ہے:۔

"ہندوستان کے بعض علاقے میں کچھ لوگ پہاڑ پر آباد ہیں اور کچھ لوگ زمین پر، پہاڑیوں میں اور زمین پر رہنے والوں میں لاگ ڈانٹ چلی جاتی ہے۔ ان میں ہر ایک ایسی ایسی باتیں کر کے دکھاتا ہے کہ اس پر حیرت ہوتی ہے اور چاہتا ہے کہ جب میں نے کر کے دکھایا ہے تو میرا فریق بھی یا تو وہی کام کر کے دکھائے ورنہ اپنی شکست تسلیم کر لے۔"

اسی سلسلہ میں ایک تماشہ جسے راوی نے دیکھا تھا یہ ہے کہ:۔

"ایک پہاڑی زمین والے کے پاس آیا اور بانسوں کے ایک جنگل کے پاس ٹھہر گیا۔ اور سرے پکڑ کر ایک بانس کو اس نے جھکایا پھر اسمیں اُسنے اپنے سر کی چوٹی باندھ دی اور کسی سے کہا کہ بانس کو پکڑے رہو۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا لوگوں سے کہا

کہ میں اپنے سر کو اس خنجر سے کاٹ دوں گا جس وقت یہ کر گزروں تو بانس کو چھوڑ دینا۔ میرا سر جو بانس کے ساتھ اوپر ہو جائے گا دیکھنا کہ اپنے منہ سے قہقہہ لگائے گا۔"

راوی کہتا ہے کہ:۔

"یہ کہنے کے بعد اُس نے واقعی سر کو خنجر سے جدا کر دیا ۔ بانس چھوڑ دیا گیا۔ سر اُوپر ہو گیا۔ لوگوں نے تھوڑی دیر کے لئے قہقہے کی آواز اس سے سُنی۔"

اس کا بیان ہے کہ اس پہاڑی نے زمین والوں کو چیلنج دیا تھا کہ اگر ہمت ہے تو اس تماشے کو وہ بھی کر کے دکھائیں لیکن ان میں کوئی اس پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کے بعد سلیمان نے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"ہندوستان کے مرد ہوں یا عورتیں۔ جب ان کی عمریں زیادہ ہو جاتی ہیں اور ہوش و حواس کمزور ہو جاتے ہیں تو وہ لوگوں سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں دریا میں ڈبو دیا جائے یا آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ کیونکہ پھر لوٹ کر چلے آنے کا انکو یقین ہے۔ (یعنی تناسخ کے عقیدے کی بنیاد پر) (سلیمان ۱۱۸)

بہرحال جس زمانہ میں ان مسلمان سیاحوں نے ہندوستان کی سیر کی تھی۔ اس قسم کے واقعات عموماً ان کے سامنے پیش آتے تھے۔ بزرگ بن شہریار نے ایک مشہور تاجر محمد بن بابشاد کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:۔

"دریا کے کنارے ایک بوڑھی عورت کو جو لباس پہنے ہوئے تھی

میں نے دیکھا کہ بیٹھی ہوئی ہے۔ پوچھا کہ تو یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ کہا میں بڑھی ہوگئی ہوں۔ بڑی دراز مدت زندگی کی میں نے گذاری ہے۔ دنیا کا معقول حصہ مجھے میسّر آیا۔ اب میں اپنے خاوند سے ملنا چاہتی ہوں۔ تاکہ میری نجات ہوجائے اور یہاں دریا کے کنارے پانی کے چڑھاؤ کی منتظر ہوں۔"

محمد بن بایشاد کہتے ہیں کہ:۔

"بڑھیا وہیں بیٹھی رہی، تا اینکہ پانی چڑھا اور بڑھیا کو لیکر غائب ہوگیا" [1]

آخر میں بزرگ بن شہریار نے لکھا ہے:۔

وقد ذکرت فی ھذا الجزء غیر موضع من اخبار الھند فی قتلھم انفسھم رضًا وبالقتل ما فیہ کفایۃ	ہندوستان کے متعلق خودکشی کے واقعات اور یہ کہ کن کن مختلف طریقوں کا اس میں وہ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے ہندوستان کی خبروں کے سلسلہ میں اس کا اتنا تذکرہ کیا ہے کہ زیادہ کی ضرورت نہیں
(عجائب الہند ص۱۳۳)	

---

[1] ڈاکٹر برنیر جو ایک فرانسیسی سیاح ہے اور شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آیا تھا اُسنے بھی اس رسم کا اپنے سفرنامے میں تذکرہ کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

"بعض لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ قریب المرگ بیمار کو دریا کے کنارے لاتے ہیں اور اُسکے پاؤں پانی میں رکھکر بتدریج اسکو گردن تک ڈبوتے ہیں اور جب سمجھ لیتے ہیں کہ اب کام کرنے کو ہے تو سارا بدن ڈبو دیتے ہیں اور اسکو وہیں چھوڑکر رو پیٹ کر چلے آتے ہیں۔"

پھر آگے اسکی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔ (باقی صفحہ آئندہ)

کالی پر انسانی قربانیاں

اسی سلسلے میں بزرگ بن شہریار نے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ کس طرح ایک "دیوی" جس کا رنگ سیاہ ہے اسی پر لوگ اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں۔ جنوبی علاقہ کے ایک شہر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"شہر کے باہر ایک بڑا عظیم پہاڑ ہے جس کے دامن میں ایک ندی بھی جاری ہے اور پہاڑ کے ایک طرف ایک مصنوعی درخت تانبے اور پیتل کا بنا دیا گیا ہے جس میں سیخوں کی طرح کانٹے بھی لگا دیئے گئے ہیں۔ اس درخت کے سامنے ایک دیو ہیکل عظیم الجثہ مورتی ہے جس کا رنگ سیاہ ہے لیکن آنکھیں زبرجد کی ہیں۔ ہر سال باشندے اس بت کا تہوار مناتے ہیں۔ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لوگ گھروں سے نکل نکل کر اس پہاڑ کی طرف آتے ہیں۔ پھر اس درخت پر چڑھتے ہیں۔ ان میں سے جو اس دیوی سے زیادہ نزدیکی حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس کے پاس آتا ہے اور اسکے سامنے سجدے میں گر جاتا ہے۔ بار بار سجدے کرتا ہے اور اسکے بعد اپنے آپکو پہاڑ سے اس طریقے سے نیچے گراتا ہے کہ ٹھیک

(باقی پچھلا) "اس رسم کا جسکو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یہ مدعا ہے کہ اس طرح پر تمام گناہ (جن سے مردہ کی روح اپنے جسمانی تعلق کے وقت ناپاک ہو رہی تھی) دھوئے جاتے ہیں"۔

(ترجمہ سفرنامہ برنیئر جلد دوم ص ۱۸۸) " از سید محبوب رضوی"

اُسی مصنوعی سینگوں والے درخت پر آکر گرے جس سے وہ کٹ کر پرزے پرزے ہو جاتا ہے اور بعض لوگ اس مورتی کے سامنے سے کھڑ کر اس طرح اپنے آپ کو گراتے ہیں کہ ایک چٹان جو اسی مورتی کے قدم کے نیچے ندی میں ہے اُسی سے ان کی کھوپڑی ٹکراتی ہے جس کے دماغ پاش پاش ہو جاتا ہے

(عجائب الہند ص)

واللہ اعلم جب ہندوستان میں خدا کے لئے بھی جانوروں کی قربانی آج جرم ٹھہرائی جا رہی ہے دیویوں اور دیوتاؤں کیلئے اب بھی انسانوں کی قربانی ہوتی ہے یا نہیں۔ علانیہ تو نہیں لیکن سنتے ہیں یہی آتا ہے کہ چھپ چھپا کر انسانی قربانی کے ذوق کو اس ملک کے باشندے اب بھی پورا کرتے رہتے ہیں۔

ننگے فقیروں کی ہیئت گذائی

واقعہ یہ ہے کہ ملی جلی بچی کھچی شکلوں میں آج بھی جو چیزیں ہندوستان میں پائی جاتی ہیں اُن کو دیکھ کر ان سیاحوں کے بیانات کی توثیق کرنی پڑتی ہے سلیمان تاجر نے ایک موقع پر یہ لکھ کر کہ:۔

وللهند عبّاد واهل علم	ہندوستان میں پوجاریوں اور اہل علم
يعرفون بالبراهمة و	کا ایک طبقہ پایا جاتا ہے جو براہمہ
شعراء لغشون الملوك	(برہمنوں) کے نام سے مشہور ہیں ان
ويسمون	میں شعرا بھی ہیں جو راجاؤں کے دربار کے

وفلاسفة وكهانت	تعلق رکھنے ہیں انہیں منجم (جوتشی) بھی
واهل زجر للغربان	ہیں اور فلاسفر بھی۔ کہانت کرنیوالے
وغيرها وبها قوم سحرة	فال نکالنے والے بھی جو کوؤں کو اڑا کر
وقوم يظهرون التخاييل	فال نکالتے ہیں اور ہندوستان میں
ويبدعون فيها و	جادوگر شعبدے دکھانے والے بھی
ذالك بقنوج خاصة	پائے جاتے ہیں جو بعض عجیب باتیں دکھاتے
(سلیمان ص۱۲۷)	ہیں۔ قنوج میں یہ خصوصاً بہت زیادہ ہیں۔

آگے اُن ننگے فقیروں اور سادھوؤں کا بھی ذکر کیا ہے جو اب بھی ملک کے مختلف اطراف واکناف میں بھی کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں جس زمانہ میں سلیمان اس ملک میں آیا تھا اُس وقت ان ننگے فقیروں یا "قوم عراۃ" کی کیا کیا خصوصیتیں تھیں، ان الفاظ میں اُسنے اُن کو بیان کیا ہے:۔

"یہ لوگ ننگے رہتے ہیں۔ ان کے بالوں سے ان کے بدن ڈھنکے رہتے ہیں بلکہ ان کی شرمگاہ کی ستر پوشی بھی ان ہی بالوں سے ہوتی ہے۔ ان کے ناخن لمبے لمبے ایسے دھاردار ہو جاتے ہیں کہ گویا وہ خنجر ہیں۔ کیونکہ اپنے ناخنوں کو یہ قطعاً نہیں کٹواتے ٹوٹ کر گر پڑیں تو یہ دوسری بات ہے۔ ان سادھوؤں میں بعض لوگ ہمیشہ سیر و سیاحت میں مشغول رہتے ہیں[1]۔ ان ننگے فقیروں کے گلے میں دھاگے سے بندھی ہوئی کھوپڑیاں ہوتی

[1] اس قسم کے فقیروں کا برنیر نے بھی اپنے سفرنامہ میں تفصیل کیساتھ ذکر کیا ہے اُس نے
(باقی اگلے صفحہ پر)

ہیں یعنی مرے ہوئے آدمی کی کھوپڑیاں۔ انکو جب بھوک لگتی ہے
تو کسی ہندوستانی کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مالک مکان
پکا ہوا خشکہ (بھات) ان کے گردوڑتا ہے اور کھوپڑی میں ڈال دیتا
ہے۔ سادھو اسی کھوپڑی میں کھانا کھا لیتا ہے۔ پھر جب تک
بھوک نہیں لگتی بھیک نہیں مانگتے۔" (سلیمان ص ۱۲۸)

لکھا ہے کہ:- یہ لوگ ایسے عجیب طور پر عمر بسر کرتے ہیں کہ اگر میں اسکو بیان کروں تو مجھے شک ہے کہ آیا اس پر کوئی اعتبار بھی کریگا۔ خصوصاً میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو جوگی کہلاتے ہیں اور جسکے معنی ہیں خدا رسیدہ۔ بہت سے جوگی بالکل ننگے رات دن تا لابوں کے پاس بڑے بڑے درختوں کے نیچے یا مندروں کے اردگرد کے مکانوں میں راکھ کا بستر کئے بیٹھے یا پڑے رہتے ہیں۔ بعض کی جٹیں پنڈلیوں تک لٹکتی رہتی ہیں اور الجھ کر ان میں گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ بعض جوگی ایک یا دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے رکھتے ہیں۔ ناخنوں کو اسقدر بڑھاتے ہیں کہ بڑھکر مڑ جاتے ہیں چنانچہ ایک شخص کے ناخن میری چھنگلیا کے نصف سے (جس سے میں نے ان کو ناپا تھا) زیادہ تھے۔ ان کے بازو ایسی سخت اور غیر طبعی ریاضت کی حالت میں کافی غذا نہ پہنچنے کے سبب سے اُن لوگوں کی طرح جو مزمن بیماریوں میں مبتلا رہکر مر جاتے ہیں سوکھ کر نہایت دُبلے پتلے ہو جاتے ہیں۔ اور رگوں اور پٹھوں کے خشک اور سخت ہو جانے کے باعث اس قابل نہیں رہتے کہ جھکا کر ان سے کچھ منہ میں ڈال سکیں۔ ان فقیروں کے پاس ان کے چیلے حاضر رہتے ہیں جو ان کو نہایت ہی مہاتما سمجھکر ان کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ جوگیوں کا ننگا اور کالا جسم، لمبے لمبے بال اور پتلی پتلی باہیں اور بل کھائے ہوئے ناخن، اور وہ ڈراؤنی وضع جو میں نے بیان کی ہے۔ اِس عالم سفلی میں اس سے زیادہ خوفناک شکل خیال میں نہیں آ سکتی۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

آج ہزار سال کے بعد بھی ان تماشوں کو کسی نہ کسی شکل میں آپ ہندوستان کے طول و عرض میں دیکھ سکتے ہیں۔

بزرگ بن شہریار نے بھی ہندوستان کے ان ننگے فقیروں کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ قریب قریب وہی باتیں جو سلیمان نے لکھی ہیں اس نے بھی بیان کی ہیں۔ بزرگ کا ایک فقرہ یہ ہے کہ:-

"کبھی کبھی یہ ننگے فقیر اپنی شرمگاہوں پر چار انگل چوڑے سے چھپرکے

(بقیہ ص ۱۱۷) جہاں کے عموماً بعض راجاؤں کے راج ہیں ان ننگے فقیروں کی اکثر ٹولیاں کی ٹولیاں دیکھی ہیں، جن کے دیکھنے سے ڈر لگتا ہے۔ بعض تو ہاتھ اوپر کو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض کے دہشت ناک بال یا تو کھلے لٹکتے یا سر کے گرد بندھے ہوئے اور بل دیئے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض کے پاس ایک بڑا بھاری سونٹا ہوتا ہے اور بعض کے کاندھے پر شیر کی خشک اور نا ملائم کھال پڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اُن کو بالکل ننگے بڑے بڑے شہروں میں پھرتے دیکھا ہے اور جیسے کہ ہمارے فرانس کے گلی کوچوں میں کسی راہب کو پھرتے دیکھ کر کوئی خیال بھی نہیں کرتا۔ ایسے ہی یہاں مرد، عورتیں اور لڑکیاں ان کو تعجب کی نگاہ سے نہیں دیکھتیں۔ بلکہ عورتیں بڑے اعتقاد سے ان کو خیرات لا کر دیتی ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ یہ لوگ بڑے ہی مقدس اور سب سے زیادہ پارسا اور نفس کو قابو میں رکھنے والے ہیں۔

(ترجمہ سفرنامہ برنیر جلد دوم ص ۱۸۶ - ۱۹۱

از سید حبیب رضوی)

کو چڑھا لیتے ہیں۔ اور کمر میں جو ڈورا ہوتا ہے اُسی کے ساتھ اس چھیڑے کو باندھ دیتے ہیں۔ جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ بدن پر ملتے ہیں۔ اور ان میں بعض اپنی مونچھ ڈاڑھی سب منڈوا دیتے ہیں۔" البتہ

ولا یحلقون شعر العانۃ — زیر ناف اور بغل کے بالوں کو کبھی
ولا شعر الابطین (ص ۱۵۶) — نہیں منڈواتے۔

مُردے کی کھوپڑیوں میں کھانا کھانے کا جو دستور تھا۔ اُس کا بھی بزرگ نے تذکرہ کیا ہے اور توجیہہ یہ بیان کی ہے کہ:۔

علی سبیل الاتعاظ بذٰلک — مُردے کی کھوپڑی میں کھانے کی غرض
والتواضع (ص ۱۵۶) — یہ ہے کہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان سیاحوں کی نظر واقعات کی تحقیق میں کتنی گہری تھی۔

لٹیروں کی چیرہ دستیاں

عجیب بات یہ ہے کہ ان ہی مؤرخین نے حالانکہ ہندوستان کے امن و امان کے قصے بھی بیان کئے ہیں۔ میں نے ہی قلقشندی کے حوالے سے یہ عبارت نقل کی تھی کہ تحفۃ الالباب والے نے ہندوستان کی تعریف میں لکھا ہے کہ

"اس ملک میں ایسا امن و امان ہے جس میں خوف کا نام نہیں"

لیکن اسی کے ساتھ ان سیاحوں نے ایسے حیرت انگیز واقعات کا بھی ذکر کیا ہے

جو اس زمانہ میں بھی امریکہ اور یورپ جیسے ممالک میں بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ آج سے صدیوں پہلے ان لوگوں کا بیان ہے۔ بزرگ بن شہریار لکھتا ہے کہ

"ہندوستان میں ایک قسم کے چور پائے جاتے ہیں۔ چوروں کے اس طبقہ کے لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر میں آمد و رفت جاری رکھتے ہیں۔ ان کا قاعدہ ہے کہ کسی بڑے تاجر کو یہ تاکتے ہیں خواہ وہ ہندوستانی ہو یا ہندوستان کے باہر کا ہو۔ کوئی ہو پھر لے سکے گھر پہنچکر یا بیچ بازار ہی میں۔ دکان پر یا راستے میں اُس کو پکڑ لیتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں چھرے ہوتے ہیں ان ہی چھروں کو سامنے کر کے اُس غریب سوداگر کو دھمکاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اتنی رقم فوراً داخل کرو۔ ورنہ تجھے ابھی قتل کر دوں گا۔ اس حالت میں اگر کوئی آگے بڑھکر ان سے مزاحمت کرنا چاہے یا حکومت کا آدمی روک ٹوک کرے تو پہلے اسی کو قتل کر دیتے ہیں۔ انہیں اسکی بالکل پروا نہیں ہوتی کہ قتل کریں گے تو خود بھی قتل کئے جائیں گے۔ ان کے نزدیک دونوں باتیں برابر ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس کسی سے وہ جتنی رقم کا مطالبہ کرتے ہیں بجز ادا کرنے کے اور کوئی نجات کی صورت اپنے لئے نہیں پاتا۔ اور نہ کوئی ڈر کے مارے ان سے تعرض کرتا ہے۔ غریب تاجر کو اپنے ساتھ لیجاتے ہیں یعنی دکان یا گھر یا باغ میں جہاں کہیں وہ کہتا ہے کہ میرا مال فلاں جگہ ہے

وہاں لیجا کر اُس سے مقررہ رقم وصول کرتے ہیں۔ ساہوکار جب تک رقم جمع کرنے میں مصروف رہتا ہے، یہ لوگ اطمینان سے کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ جب رقم سب جمع ہو جاتی ہے تو ان کا آدمی آتا ہے۔ اُس پر لاد کر جہاں ان کا جی چاہتا ہے اُس آدمی کو ہتھیاروں سے گھیرے ہوئے لیجاتے ہیں اور مال و متاع پر جس کے چاہتے ہیں اس طرح قبضہ کرتے ہیں[1]۔" (عجائب الہند ص ۱۵۲)

بزرگ بن شہریار نے ہندوستان کے لیٹروں کے اس خاص طبقہ کا ذکر کرنیکے بعد ایک مسلمان تاجر جن کا نام محمد بن مسلم تھا لکھا ہے کہ وطن اصلی تو انکا سیراف تھا لیکن ہندوستان کے مشہور ساحلی شہر تھانہ میں بیس برس سے

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس قسم کے لیٹرے عام طور پر پھیلے ہوئے تھے یہ بیان تو بزرگ کا ہے سلیمان کی کتاب میں بھی ان لٹیروں کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے لکھا ہے کہ "ایک خاص قسم کا خنجر جسے جزلی کہتے ہیں ان کے پاس ہوتے ہیں یہ لوگ زور سے کسی تاجر کے گلے کو پکڑ لیتے ہیں پھر اسکی گردن میں لٹک جاتے ہیں اور خنجر کو اسکے سر پر تھامے ہوئے کھینچتے ہوئے لے سب کے سامنے شہر کے باہر لیجاتے ہیں اور ان کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ جونہی لوگ اس تاجر کو چھڑانا چاہیں پہلے تاجر کو قتل کر دیتے ہیں پھر اپنے آپ کو مار ڈالتے ہیں بہرحال اس طرح باہر نکال کر اس سے زر فدیہ طلب کرتے ہیں اور تاجر بے چارہ اُسے ادا کرتا ہے۔" (ص ۱۲۱)

اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ سیلون کے ایک راجہ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان ڈاکوؤں کا قلع قمع کیا جائے بہت سے ہندوستانی اور عرب تاجر اسی راہ میں مارے گئے تب کچھ جا کر بات ٹھنڈی پڑی اور تاجروں کو کچھ امن نصیب ہوا۔" ۱۲

زیادہ دن تک ان کا قیام رہا تھا اور ہندوستان کے اکثر علاقوں کی اس شخص نے سیر بھی کی تھی اس کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ:۔

"بارہ آدمی ایک دفعہ لیٹروں کے اسی طبقہ کے تھانہ آئے اور ایک ہندی بنئے کو انہوں نے دھر لیا۔ یہ بنیا اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے بوڑھے باپ کے پاس بڑی دولت تھی اور تھا بھی بڑا محنتی اور جفاکش بیٹے سے بڑی محبت تھی کیونکہ لے دیکر چشم و چراغ اس کا وہی ایک بچہ تھا۔ بہر حال اندر گھر میں گھس کر اس لڑکے کو انہوں نے اپنے قبضہ میں کر کے دس ہزار اشرفیوں کا مطالبہ شروع کیا۔ یا کچھ اسی کے قریب قریب بنئے کے باپ کیلئے یہ کوئی بڑی رقم نہ تھی۔ لڑکے نے آدمی اپنے باپ کے پاس روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ خدا کیلئے اس وقت اتنی رقم دیکر مجھے جلد خرید لیجئے اور ان پاجیوں کے ہاتھ سے نجات دلوایئے۔

باپ دوڑا ہوا آیا اور ان لیٹروں کی خوشامدیں کرنے لگا اور بڑی لجاجت سے اس نے کہنا شروع کیا کہ ایک ہزار روپیہ لیکر میرے لڑکے کی جان بخشئے لیکن لیٹرے کہاں ماننے والے تھے جو رقم انہوں نے کہدی تھی اسی پر اڑے رہے اور بولے کہ ایک پیسہ کم دس ہزار دینار سے تو ہم لیں گے نہیں بوڑھے کو غصہ آگیا اور سیدھا شہر کے راجہ کے پاس پہنچا

اپنا حال بیان کیا اور بولا کہ جب تک اس قسم کے بدمعاشوں کو قرار واقعی سزا نہ دی جائے گی آپ کے ملک میں کون رہ سکتا ہے
راجہ نے کہا کہ یہ تو میرے لئے بالکل آسان ہے کہ ابھی ان ڈاکوؤں کو قتل کرا دوں لیکن ڈر اسکا ہے کہ تیرا بیٹا بھی تو ان لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیگا اور تیرا وہی ایک اکلوتا لڑکا ہے۔"
محمد بن مسلم کا بیان ہے کہ بوڑھے بنئے نے اسکے جواب میں راجہ سے کہا کہ:-
" میں کیا کروں وہ تو بہت بڑی رقم کا مطالبہ کرتے ہیں، میں یہ کیسے گوارا کر لوں کہ اپنے آپ کو فقیر و محتاج بنا کر لڑکے کو ان کے ہاتھوں سے چھڑاؤں۔"
اس قساوت قلبی پر آمادہ ہونے کے بعد اس بوڑھے نے خود راجہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ آپ حکم دیجئے، اس مکان کی چاروں طرف لکڑیاں جمع کی جائیں، مکان کا دروازہ بند کر دیا جائے اور لکڑی میں آگ لگوا دیجئے
راجہ نے کہا کہ بوڑھے بنئے! تیرا لڑکا بھی تو ان کے ساتھ جل بھن کر خاک ہو جائیگا۔"
جواب میں اس نے کہا۔

احتراقهم اهون عندی	مال کے جانے سے میرے لئے یہ زیادہ
من ذهاب مالی	آسان ہے کہ سب لوگ جل جائیں!

راجہ یہ سن کر خود اٹھا اور اس گھر کے دروازے کو بند کرا کے آگ لگا دینے کا حکم دیا۔ بوڑھے بنئے کے سامنے اسکے لڑکے کے ساتھ سب لوگ جل کر بھسم ہو گئے اور وہ دیکھتا رہا۔ (عجائب الہند ص۱۵۳)

ممکن ہے کہ اس قصے میں کچھ مبالغہ کا رنگ ہو لیکن ہندوستان کے ایک طبقہ کے متعلق میرے خیال میں یہ ایک قدیم ترین مکتوبہ شہادت ہے جس کو کم از کم اتنا تو یقیناً ظاہر ہوتا ہے کہ جزرسی کے جو بیسیوں قصے اس طبقہ کے متعلق زبان زد عام ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہزار برس پہلے بھی ان کی شہرت اس خاص صفت میں پھیلی ہوئی تھی اور ضمناً اس واقعہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ باہر کی صرف قانونی حکومت جیسی آجکل یورپ و امریکہ میں قائم ہے وہ صحیح امن وامان کے قائم کرنے میں پہلے بھی ناکام ثابت ہو چکی ہے اور آج تک ناکام ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ قلوب کے تشابہ اور نتائج کی وحدت کا کیا حال ہے۔ قریب قریب ان ہی الفاظ اور انہی خصوصیات کے ساتھ آئے دن یورپ و امریکہ کی خبریں لوٹ مار کے متعلق اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں

سلہ تحفۃ الالباب سے نقل قشندی نے محمد بن عبدالرحیم اقلیشی کے حوالے سے ہندوستان کے امن وامان کے جس حال کو بیان کیا ہے ان ہی تاریخوں میں اس قسم کے واقعات دیکھنے کے بعد خیال گذرتا ہے کہ شاید محمد بن عبدالرحیم نے ہندوستان کے اس زمانہ کا حال بیان کیا ہے جب مسلمانوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر کے اس قسم کے ڈاکوؤں اور رہزنوں کا جہاں تک ان کا امکان میں تھا قلع قمع کر دیا تھا۔ اگرچہ بسا اوقات اس طبقہ کے افراد اسلامی عہد میں بھی سر نکلتے رہتے ہیں لیکن دن دہاڑے اتنی سینہ زوری کے ساتھ بر سر بازار اس قسم کی جرأت کی نظیر مسلمانوں کے زمانہ میں نہیں ملتی۔ اس قسم کے واقعات اگر سننے جاتے ہیں تو امریکہ و یورپ ہی کے متمدن ممالک کے متعلق سنے جاتے ہیں۔ ۱۲

چین

ہندوستان اور چین کا تقابل

اور جیسے ان لوگوں نے ہندوستان کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا ذکر بغیر کسی تنگدلی کے کیا ہے بجنسہٖ یہی طریقہ ان مسلمانوں نے چین کے حالات کے بیان کرنے میں اختیار کیا ہے۔ بلکہ ان دونوں مشرقی ملکوں میں مقابلہ کرتے ہوئے اپنے تاثرات بھی ظاہر کئے ہیں۔ مثلاً سلیمان نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"ہندوستان اور چین میں فرق یہ ہے کہ ہندوستان زیادہ تر دیہاتوں سے آباد ہے، شہر اسمیں کم ہیں لیکن چین کا کوئی ایسا حصہ نہیں ہے جہاں باضابطہ شہر پناہ رکھنے والے بڑے بڑے شہر نہ ہوں۔ اور گو چین کی آب و ہوا ہندوستان کی آب و ہوا سے بہتر ہے اسی لئے چین میں اندھے، کانے یا آفت رسیدہ لوگ کم نظر آتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر ہندوستان

کے علاقوں کا بھی یہی حال ہے۔ بڑے بڑے دریاؤں کے لحاظ
سے دونوں ملکوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور بارش بھی ان
دونوں اقلیموں میں بکثرت ہوتی ہے۔ البتہ ہندوستان میں
ریگستانی صحرا و بیابان بھی پائے جاتے ہیں اور اچھا خاصا علاقہ
اس کا صحرائی ہے لیکن چین میں اوّل سے آخر تک اس قسم
کے غیر آباد بیابان نہیں دکھائی دیتے۔"

دونوں ملکوں کا اختلافِ مذاق

دونوں ملکوں کے لباس کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:۔

"چینی لباس میں عرب (یعنی مسلمانوں) سے زیادہ مشابہ ہیں
یعنی قبا پہنتے ہیں کمربند باندھتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے
باشندے زیادہ تر دو چادروں پر قناعت کرتے ہیں۔ البتہ
سونے اور جواہرات کے زیور ہندوستانی زیادہ پہنتے ہیں انکے
مرد بھی اور ان کی عورتیں بھی۔" (سلیمان ص۵۹)

مذاق کا ایک عجیب فرق ان دونوں ملکوں کے متعلق یہ بھی بتایا ہے کہ:۔

"چینیوں کے پاس ہاتھی نہیں ہوتے بلکہ اپنے ملک میں ہاتھی
کو دیکھنا بھی وہ پسند نہیں کرتے ہیں۔ وہ اس جانور کو منحوس
سمجھتے ہیں۔"

(سلیمان ص۵۸)

چین میں حصولِ علم کا مذاق

پھر ان امور کے ساتھ ساتھ چینیوں کی طرف انہوں نے بعض ایسی خصوصیتوں کو منسوب کیا ہے جنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے خصوصاً جن باتوں کو آج مغربی تمدن کی خصوصیات میں شمار کیا جاتا ہے ان کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

الفقیر والغنی من اھل الصین امیر ہوں یا غریب چھوٹے ہوں یا
والصغیر والکبیر یتعلم بڑے اہلِ چین میں ہر ایک خط
الخط والکتابۃ لکھنا پڑھنا سیکھتا ہے۔

(سلیمان ص ۳۸)

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ چین جیسے طویل و عریض ملک میں آج سے ہزار سال پہلے لازمی تعلیم مروج تھی اور یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ لازمی تعلیم مغربی تہذیب کی خصوصیت ہے۔ اگر سلیمان کا بیان صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ خصوصیت کا یہ دعویٰ بے معنی ہو جاتا ہے، اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"چین کے تمام شہروں اور اس ملک کی آبادیوں میں مدارس جاری ہیں۔ جن میں مدرسین حکومت کی طرف سے مقرر ہیں اور شاہی خزانے سے ان کو تنخواہیں ملتی ہیں۔ ملک کے فقراء اور غرباء کو یہ لوگ مفت تعلیم دیتے ہیں۔"

(سلیمان ص ۴۷)

اہلِ چین کے تہذیبی و معاشرتی خصوصیات

اس نے یہ بھی بیان کیا ہے اور شاید عام تعلیم کی بنا پر یہ توقع کی جاتی تھی کہ :۔

"حکومت میں درخواست پیش کرنے والوں کی زبانی درخواست لائقِ توجہ نہیں سمجھی جاتی ہے جب تک لکھکر نہ دی جائے اور داخل کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لیا جاتا ہے کہ درخواست حکومت کے ضوابط و اصول کے مطابق ہے یا نہیں۔ ایک خاص آدمی اس کام کے لئے مقرر ہے۔ اگر درخواست اصول کے مطابق نہیں ہوتی تو وہ مسترد کر دی جاتی ہے" (سلیمان ص۳۹)

لین دین میں بھی اسکے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ چینی باضابطہ تحریروں سے کام لیتے تھے۔ سلیمان کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ :۔

"کسی شخص کا دین کسی کے ذمے جب ہوتا ہے تو ایک تحریر دائن کو اور ایک تحریر مدیون کو لکھنی پڑتی ہے، دونوں کو اپنی تحریروں پر خاص قسم کے نشانات بنانے پڑتے ہیں"۔

الغرض آجکل بیان تحریری عرضی دعویٰ، پٹہ قبولیت نامہ وغیرہ کاغذات انگریزی دفاتر میں جو مروج ہیں معلوم ہوتا ہے کہ چین میں ہمیشہ سے ان کا رواج تھا۔ بلکہ ایک عجیب بات اسی سلسلہ میں اسی نے یہ بھی لکھی ہے کہ :۔

"چینیوں کے ملک میں تھوڑی تھوڑی دور پر خاص قسم کے پتھر نصب ہیں جنکی لمبائی دس ہاتھ کی ہوگی۔ ان پتھروں میں بیمار لوگ

اور اُن بیماریوں کی دواؤں کے نام کندہ کر دیئے گئے ہیں یعنی
فلاں بیماری ہو تو اس کی دوا فلاں ہے اور غرباء جن کے پاس
دوائیں خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے انہیں حکومت
کے خزانے سے دام ملتے ہیں۔" (سلیمان ص۳۴)

گو سلیمان نے لکھا نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عام امراض اور ان کے علاج و معالجہ کے طریقوں کی تعلیم چینیوں میں شاید عام تھی؛ اور حکومت کی فیاضیوں کا سلسلہ جو چین میں جاری تھا ان کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ابھی یورپ کو چین سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ:۔

"ایک مقام سے دوسرے مقام تک جب چین میں کوئی سفر کرنا
چاہتا ہے تو حکومت اور خصّی (ہر مقام کے گورنر) سے دو قسم کی
تحریریں اپنے ساتھ لیتا ہے۔ ایک میں تو اس شخص کا نام اسکی عمر،
اُسکے رفقاء کی عمریں؛ اور یہ کہ وہ کس قبیلے کا آدمی ہے؛ لکھا ہوتا ہے
اور دوسرے میں ان اموال کی تفصیل ہوتی ہے کہ جو اس شخص کے
پاس ہوتے ہیں۔"

سلیمان نے لکھا ہے کہ اس کا اس ملک میں بڑا اہتمام ہے مقصود ان کا یہ ہے کہ:۔

"سفر کرنے والوں کا مال ضائع نہ ہو۔ اور اگر کہیں ضائع ہو جاتا
ہے (تو فہرست مکتوبہ) سے پتہ چل جاتا ہے۔ یا اگر مسافر راستہ میں
کہیں مر گیا۔ بہر حال حکومت اُس کے مال کو واپس کرتی ہے خواہ
اسی کو یا اُسکے وارثوں کو۔" (سلیمان ص۳۳)

سلیمان ہی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ:-

"جس زمانہ میں گرانی پیدا ہو جاتی ہے تو حکومت اپنے خاص انبار خانوں سے غلّہ بازار میں نکالتی ہے اور بازار کا جو بھاؤ ہوتا ہے اُس سے کم دام میں وہ فروخت کرتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس ملک میں کبھی گرانی پیدا ہونے نہیں پاتی۔" (سلیمان ص۲۱)

اسی طرح جب کوئی دیوالیہ ہو جاتا ہے تو باضابطہ تحقیق کے بعد حکومت پر جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ واقعی وہ مفلس ہو گیا ہے کہ:-

"جن جن لوگوں کا بقایا اُس دیوالیہ نکالنے والے شخص پر ہوتا ہے سب کو حکومت ادا کر دیتی ہے۔" (سلیمان ص۲۴)

سلیمان ہی نے لکھا ہے کہ:-

"ہندوستان کی طرح چین میں بھی مسلمانوں کے مقدمات کے فیصلے کیلئے حاکم مسلمان ہی مقرر ہوتا تھا اور وہی عید کے دن مسلمانوں کو نماز پڑھاتا تھا اور اسلامی قوانین کے مطابق مسلمانوں کے فیصلے کرتا تھا۔"[1] (سلیمان ص۱۴)

---

[1] یہ واقعہ ہے کہ چین کے مسلمان اپنی حکومت نہ ہونے کے باوجود ہمیشہ ایک خاص حیثیت و عظمت کے مالک رہے ہیں۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے بھی جو آٹھویں صدی ہجری کا سیاح ہے چین میں مسلمانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"چین کے ہر شہر میں مسلمانوں کا ایک محلہ ہے جس میں صرف وہی آباد ہیں وہاں انکی مسجدیں ہیں جن میں جمعہ وغیرہ کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کی وہاں تعظیم و توقیر کی جاتی ہے۔ چین کے ہر شہر میں

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور اسی قسم کی حیرت انگیز باتوں کا ان لوگوں نے چینیوں کے متعلق تذکرہ کیا ہے یورپ والوں کے متعلق عام طور پر جو یہ مشہور ہے کہ ان کا موجودہ تمدن رومیوں اور یونانیوں کے تمدن سے ماخوذ ہے مشرق سے انہوں نے کچھ نہیں لیا ہے۔ چینیوں کے حالات پڑھکر مجھے تو اب انہیں شک پیدا ہو گیا ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر چیزیں انہوں نے چینیوں ہی سے اخذ کی ہیں بلکہ ابھی ان کو ان سے بہت کچھ لینا ہے۔ ان دونوں تمدنوں میں بعض امور کے متعلق کچھ عجیب قسم کا تشابہ معلوم ہوتا ہے۔ ان مسلمان سیاحوں کا بیان ہے کہ باہر سے چین کے باشندے بڑے پاک وصاف بنے ٹھنے رہتے ہیں اور ٹھیک آج یورپ والوں کا جو حال ہے کہ کپڑوں پر کپڑے پہنتے چلے جاتے ہیں لکھا ہے کہ یہی حال چینیوں کا بھی تھا۔ بلکہ چینی تو حد کر دیتے تھے کہ صرف جسم کے بالائی حصہ ہی کو نہیں بلکہ ٹانگوں تک پر سردیوں کے موسم میں:-

"دو دو شلواریں چڑھا لیتے ہیں۔ بلکہ تین تین چار چار پانچ پانچ پائجامے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق لوگ پہنتے ہیں"۔

(باقی پچھلا) مسلمانوں کا ایک شیخ الاسلام ضرور ہوتا ہے۔ جس کے پاس مسلمانوں کے تمام معاملات جاتے ہیں، اور ایک قاضی بھی ہوتا ہے جو ان کے مقدمات کے فیصلے کرتا ہے"۔

پھر آگے چلکر لکھتا ہے کہ:-

"ملک چین تمام ملکوں سے زیادہ پرامن ہے۔ اور مسافر کے لئے تمام ملکوں سے اچھا ہے"۔

"سید محبوب رضوی"

اور اس کی ایک طبی توجیہ بھی بیان کرتے تھے کہ:-

"جسم کے نچلے حصہ ہی میں سردی کے سرایت کرنے کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے" سلیمان صـ۲۵

اور نہ صرف سردیوں میں بلکہ سلیمان نے ایک قصہ ایک چینی آفیسر کا بیان کیا ہے۔

"وہ کسی عربی سوداگر کے پاس آیا، سوداگر کے پاس بیٹھا تو چینی افسر نے دیکھا کہ بار بار وہ اس کے سینے کو دیکھ رہا ہے جس پر ایک تل تھا اور کپڑوں کے اندر سے نظر آرہا تھا۔ عرب سوداگر کو تعجب ہو رہا تھا کہ باوجود کپڑوں کے تل باہر سے کیسے نظر آرہا ہے۔ اس پر افسر نے اس سے کہا کہ تم کو کس بات پر حیرت ہو رہی ہے۔ اس نے حیرت کی وجہ بیان کی تو وہ ہنسا اور اس نے اپنی آستین کو آگے بڑھا کر سوداگر سے کہا کہ گن لو میں کتنے کپڑے پہنے ہوئے ہوں اس نے گنا تو معلوم ہوا کہ پانچ اچکنیں حریر کی چینی افسر پہنے ہوئے تھا لیکن کپڑے اتنے باریک تھے کہ ان پانچ کپڑوں کے اندر بھی اس کے سینے پر جو تل تھا۔ وہ باہر سے نظر آرہا تھا" (سلیمان صـ۷۵)

جس سے چینیوں کی اس مہارت کا تو خیر اندازہ ہی ہوتا ہے جو پارچہ بافی کی صنعت میں انہیں حاصل تھی۔ سلیمان نے لکھا ہے کہ:-

"بادشاہوں کے یہاں چین میں جو کپڑے استعمال ہوتے ہیں وہ ان کپڑوں سے بھی اعلیٰ ہوتے ہیں"۔

پتھر کے کوئلہ کا استعمال

کہنے والوں کو کیا کہئے جو کہتے پھرتے ہیں کہ پتھر کے کوئلوں کے استعمال سے یورپ ہی نے دُنیا کو واقف کیا ہے اس سے پہلے لوگ اس کے استعمال سے ناواقف تھے۔ اب میں کیا کہوں کہ یورپ نے جس طرح اور بہت سی چیزیں چین سے اخذ کی ہیں ان ہی میں پتھر کے کوئلے کا استعمال بھی ہے۔ ابن بطوطہ نے جو آٹھویں صدی ہجری کا سیاح ہے اپنے سفرنامہ میں انہی سنگین کوئلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چین میں بجز اس کے کوئی دوسری چیز ایندھن میں استعمال ہی نہیں ہوتی۔

نوٹ کا رواج

اسی نے چین کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ بجائے چاندی سونے اور تانبے وغیرہ کے سکوں کے عام طور پر یہاں کاغذی سکہ مروج ہے اس نے اس کا نقشہ بھی بتایا ہے اور لکھا ہے کہ دوسرے سکے بازار میں لوگ مشکل سے قبول کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ نوٹ کا رواج بھی ایک قدیم رواج ہے۔

چینی تہذیب کا یورپی اقوام پر اثر

لیکن مجھے اسی کے ساتھ چینیوں کے اس مذاق کو دکھانا ہے کہ باہر سے جامہ زیبی کا تو ان کے یہ حال تھا لیکن اندر ان کی کیفیت جو تھی وہ بھی انہی

انصاف پسند غیر متعصب سیاحوں ہی کے بیان سے معلوم کیجئے سلیمان ہی نے لکھا ہے کہ:۔

"ان کے اندر نظافت اور طہارت قطعاً نہیں پائی جاتی۔"

گویا جو حال آج یورپ والوں کا ہے بلکہ اسی کی تفصیل کرتے ہوئے سلیمان نے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ:۔

ولا یستنجون بالماء بل یمسحون بالقراطیس الصینیة۔ (سلیمان ص۲۵) استنجا پانی سے چین کے لوگ نہیں کرتے بلکہ کاغذ سے پونچھ لیتے ہیں۔

گویا کاغذ سے استنجا کا طریقہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ والوں نے چینیوں ہی سے سیکھا ہے۔ یہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ:۔

"چینی پیشاب عموماً کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔ یہاں کے عام باشندوں کی یہی عادت ہے۔"

بلکہ اسی سلسلہ میں چینی امراء کے ایک خاص لطیفہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ:۔

"ان میں جو امیر اور بڑے لوگ ہیں وہ ایک سوراخ دار لکڑی (نلکی) رکھتے ہیں جس کا طول ایک ہاتھ کے برابر ہوگا۔ اس لکڑی کے دونوں طرف سوراخ ہوتا ہے اور کسی روغن سے اس پر پالش بھی کر دی جاتی ہے۔ جب پیشاب کی ضرورت ہوتی ہے تو اس نلکی کے ذریعے کھڑے کھڑے وہ پیشاب کرتے ہیں" (سلیمان ص۱۱۴)

اور عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے متعلق حالانکہ انہی لوگوں کا بیان ہے کہ روزانہ غسل کے بغیر وہ کھانا بھی نہیں کھاتے لیکن پیشاب کے سلسلہ میں ان کے متعلق بھی لکھا ہے کہ:۔

"پیشاب کرنے کے بعد بغیر اس کے کہ نجاست کو صاف کریں فوراً کپڑے

کو برابر کر لیتے ہیں" (سلیمان ص ۱۱۸)

عربوں کو ہندوستانیوں کی اس عادت پر تعجب ہوا ہے۔

چینیوں کی معاشرت اور انکے تمدن کے اکثر عناصر کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ والوں نے تتبع کیا ہے چینیوں کی عورتوں کی حالت بیان کرتے ہوئے سلیمان نے لکھا ہے کہ

"ان کی عورتیں اپنے سروں کو کھلا رکھتی ہیں اور بالوں میں کنگھیاں لگاتی ہیں کبھی کبھی ایک عورت کے سر میں بیس بیس کنگھیاں نظر آتی ہیں"
(سلیمان ص ۲۵)

چینیوں کی آدم خوری

خلاصہ یہ ہے کہ باوجود اس عقل و ہوش کے چونکہ چینیوں کا تعلق اس زمانہ میں کسی الٰہی دین سے باقی نہیں رہا تھا اسی لئے بعض باتیں انکی ایسی ان لوگوں نے بیان کی ہیں جو سمجھ میں نہیں آتا کہ باوجود دانش و دانائی فرزانگی و فرہنگی بیچارے کن حالات میں مبتلا تھے اسی سلیمان تاجر کی کتاب اور اسکے ساتھ ابوزید سیرافی کا جو ضمیمہ ہے اس میں یہ عجیب بات لکھی ہے کہ:۔

"چینیوں کا قاعدہ ہے کہ انہیں سے کوئی قوم جب اسی ملک کی دوسری قوم پر حملہ کرتی ہے تو نہیں بالکل تباہ کر دیتی ہے اور وہاں کے باشندوں کو وہ کھا جاتے ہیں"[1]

---

[1] حال میں جاپان کی جنگ جو ہوئی تھی تو منجملہ اور خبروں کے بعض خبریں یہ بھی آئی تھیں کہ جاپانی دشمن کے قیدیوں کو یا جو ان میں قتل ہو جاتے ہیں انکو بھون کر کھا گئے۔ اس سے بھی سلیمان سیرافی کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ ۱۲

اسی کے بعد لکھا ہے کہ:۔ یہ اُن کے مذہب اور قانون میں جائز ہو
وذالک مباح لھم فی شرائعھم کیونکہ انسانی گوشت تواُن کے بازاروں
فی اسواقھم (سلیمان ۶۲) میں بکتے ہیں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ چینیوں میں جب کوئی ایسا جرم کرتا ہے جسکی سزا قتل ہو تو قتل کرنے کے بعد؛

یاکلہ ثم الی من یاکلہ ان لوگوں کے حوالہ مقتول کی لاش کر دی
(سلیمان ص۶۸) جاتی ہے جو ان کو کھا جاتے ہیں۔

اور یہ کوئی دس بیس ہزار سال پہلے کا قصہ نہیں ہے بلکہ ابو زید السیرافی جو سلیمان تاجر کے بعد کا آدمی ہے وہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ انسانوں کے گوشت کا چین کے بازاروں میں بکنا ایک عام بات ہے۔

اسمیں شک نہیں جایا کہ میں نے بھی لکھا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو بھی ان لوگوں نے اُس زمانہ میں چوہے وغیرہ چیزوں کو کھا جاتے دیکھا تھا لیکن کہاں آدم خوری اور کہاں موش خوری اگرچہ اس زمانے میں ہندوستان کا بھی پیغمبروں کے لائے ہوئے خدائی دین سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا اور جیسے چینی صرف عقل کی رہنمائی میں زندگی کے ضوابط واصول بنا بنا کر جی رہے تھے یہی حال ہندوستان والوں کا بھی تھا لیکن اس اعتبار سے دیکھئے تو ہندوستان پھر بھی آپ کو بسا غنیمت معلوم ہوگا، نہ صرف اسی ایک معاملہ میں بلکہ اور بھی مختلف چیزیں ان ہی سیاحوں کی کتابوں میں ملتی ہیں جن سے چین اور ہندوستان

کے غیر پیغمبرانہ تمدّن وتہذیب میں نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے۔

بدکاری کی اجازت اور اُسکے اُڈّے

مثلاً چین کے متعلق بیان کیا ہے کہ:۔

"چینیوں میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ اُن کی عورتوں میں جو عورت شادی کرنے سے گریز کرنا چاہتی ہو اور اس کی خواہش ہو کہ آوارگی کی زندگی بسر کرے حکومت کی طرف سے اسکی ممانعت نہیں ہے بلکہ قاعدہ ہے کہ پولیس کا جو افسر اس علاقے میں ہوتا ہے عورت اُس کے دفتر میں حاضر ہوجاتی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ وہ شادی کر کے زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی اور خرچی کمانے والی بیسواؤں میں شریک ہونا چاہتی ہے پھر درخواست دیتی ہے کہ جس رجسٹر میں اس قسم کی بدچلن عورتوں کے نام لکھے جاتے ہیں اسی میں میرا نام بھی درج کر دیا جائے، تب اُس عورت کا نام، اُس کا نسب، اس کی شکل وصورت، حلیہ اور اس کے گھر کا پتہ، دیوان الزوانی (بیسوا عورتوں کے دفتر) میں لکھ لیا جاتا ہے اور گلے میں اُس عورت کے ایک دھاگہ ڈال دیا جاتا ہے جس میں تانبے کی ایک انگوٹھی ہوتی ہے جس میں حکومت کی مہر کندہ ہوتی ہے۔ اور اس کو ایک اجازت نامہ لکھ کر دیدیا جاتا ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ بیسواؤں میں شریک ہونے کی اسے اجازت دی جاتی ہے اور یہ کہ سرکاری خزانہ میں ہر سال اتنی رقم داخل کرتی رہے

گی۔ اسی میں یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ اس عورت سے جو کوئی باضابطہ عقد کرے گا، وہ قتل کر دیا جائے گا۔ عورت اس اجازت نامہ کو اپنے ساتھ رکھتی ہے اور سالانہ جو رقم اُس کے ذمہ واجب کی جاتی ہے ادا کرتی ہے۔ اس طبقہ کی عورتوں کا قاعدہ ہے کہ پچھلے پہر بن ٹھن کر بغیر کسی حجاب کے گذرگاہوں پر بیٹھتی ہیں، فسق و فجور والے اُن کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ رات ان عورتوں کے پاس بسر کر کے صبح کو نکل آتے ہیں۔"

(صـ)

عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف چینیوں کے تمدن میں زنا کا شمار ایسے سخت جرائم میں تھا جس کی سزا اُن کے یہاں قتل تھی۔ ابوزید سیرافی سلیمان کی کتاب کے تکملہ میں لکھتا ہے کہ:۔

"شادی شدہ مرد و عورت اگر زنا کے مرتکب ہوں تو چینی قانون میں اس کی سزا قتل ہے۔"

اور قتل بھی کس طریقے سے؟ ابوزید ہی کا بیان ہے کہ:۔

دونوں ہاتھوں کو پہلے خوب مضبوطی کے ساتھ باندھ دینے کے بعد پھر ان بندھے ہوئے ہاتھوں کو گردن پر چڑھا دیتے ہیں، پھر داہنے پاؤں کو اوپر کر کے اُسی بندھے ہوئے داہنے ہاتھ میں گھسیڑ دیتے ہیں، اسی

طرح بائیں پاؤں کو بائیں ہاتھ میں، اس ترکیب سے دونوں تلوے اُس کی پیٹھ کی طرف نکل آتے ہیں اور آدمی گویا ایک گیند کی طرح بن جاتا ہے۔ اپنے اُوپر کسی قسم کا قابو اُس کو باقی نہیں رہتا۔ نہ ہل سکتا ہے اور نہ کسی قسم کی جنبش کا اختیار اس میں باقی رہتا ہے۔ اور اب ضرورت اسکی نہیں رہتی کہ کوئی پکڑنے والا اُسے پکڑے رہے۔ اس تدبیر کے بعد اُس کی گردن کو مُہرے سے توڑ دیتے ہیں اور ریڑھ کی ساری ہڈیاں پیٹ کی طرف نکل آتی ہیں۔ وہ ایک ایسے حال میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اگر اُسے یونہی چھوڑ دیا جائے تو اس کا دم نکل جائے لیکن اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ ایک خاص قسم کی لکڑی ہوتی ہے جس سے اُس کو مارتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کا دم نکل جاتا ہے۔"

اس موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"اس کی لاش کھانے والوں کے سپرد کردی جاتی ہے۔"

بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً زناکاری کو جیسے جائز نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہی بات کہ سارے انسان اُن کی نگاہوں میں ایک نہیں تھے اور ہر عورت جو بہرحال کسی کی بیٹی اور بہن ہی ہوتی ہے اُس کے ناموس کی حفاظت ان کی نگاہوں میں ضروری نہیں تھی۔

اور میں خیال کرتا ہوں کہ ابن خرداذبہ نے اپنی کتاب میں ہندوستان

کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ:-

"ہندوستان کے راجہ زنا کو حلال قرار دیتے ہیں۔ صرف القمار (غالباً کامروپ آسام) کے راجہ کے ملک میں زنا کو حرام قرار دیا گیا ہے۔" سلیمان صفحہ ۶۶

اس سے مراد وہی بات ہوگی جو جینیوں کے دستور میں نظر آتی ہے کیونکہ اسلیمان تاجر کے حوالے سے میں پہلے یہ نقل کر چکا ہوں کہ ہندوستان میں بھی زنا کی سزا قتل ہی تھی۔ مرد و عورت دونوں کی رضامندی سے فعل اگر صادر ہوا ہو تو دونوں ختم کر دیے جاتے تھے اور اگر ثابت ہو جائے کہ عورت کے ساتھ جبر و زبردستی سے کام لیا گیا ہے تو صرف مرد ہی قتل ہوتا تھا۔

چین کے متعلق انہی سیاحوں اور تاجروں کا یہ بیان اگر صحیح ہے جو سلیمان نے لکھا ہے میں بجنسہ اس کے الفاظ نقل کر دیتا ہوں۔ وہ لکھتا ہے:-

واهل الصين يلوطون بغلمان اور چین والے چھوکروں کے ساتھ فعل خلاف وضع فطری کے مرتکب ہوتے ہیں (صفحہ ۵۴)

تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا کہ چوری چھپے نہیں بلکہ علانیہ چین والوں میں اس بدعادت کا رواج تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی طرف سے اس پر لوگوں کی گرفت نہیں ہوتی تھی بلکہ جیسے فاحشہ عورتوں کو فحش کاری کی باضابطہ سند حکومت کی طرف سے دی جاتی تھی اسی طرح شاید اس فعل کا حکومت کی طرف سے لائسنس بھی دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ میں بار بار کہتا رہا ہوں کہ پیغمبرانہ اور غیر پیغمبرانہ نظامِ حیات میں بڑا فرق ہے۔ چین صنعت

وحرفت، طب وفلسفہ حکمت ودانش کی جن بلندیوں تک ترقی کر کے جس زمانہ میں پہونچا ہوا تھا۔ ٹھیک اُن ہی دنوں میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان ہی دانش مندوں کی نگاہ ایسے غیر معمولی اخلاقی جرم کے جرم ہونے تک نہ پہنچ سکی۔[۱]

---

[۱] ڈاکٹر اشرف الحق مرحوم حیدر آبادی جنہوں نے پچھلے دنوں خاص جنسی مسائل پر مختلف رسائل شائع کئے تھے۔ خیال آتا ہے کہ ان کے انہی رسائل میں سے کسی رسالہ میں یہ چیز بھی درج تھی کہ جرمنی کے ریشٹاغ میں ایک رکن نے قوم لوط کی اس عادت کو قانونی جواز عطا کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ یاد پڑتا ہے کہ ڈاکٹر اشرف الحق صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ آخر اس قانون کو ریشتاغ سے اس ممبر نے منوا بھی لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب شاید اس سے خود بھی ملے تھے۔

بہر حال مجھے یہ کہنا ہے کہ مغربی تہذیب وتمدن کے ائمہ کو آپ دیکھ رہے ہیں کہ خدا اور خدائی تعلیم سے ٹوٹ کر باایں ہمہ عقل وخرد انگی کن خندقوں میں جا گرے ہیں۔ عقلِ انسانی۔ انسانی عقل اُس وقت تک بن ہی نہیں سکتی۔ جب تک کہ انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیم کی روشنی سے وہ منور نہ ہو۔ اس روشنی سے بے تعلق ہو کر چلنے والے کل بھی ان ہی گڑھوں میں گرے تھے۔ اور آج بھی ٹھوکریں کھا کھا کر وہ ان ہی میں گر رہے ہیں۔ اعاذنا اللہ من طغیان العقل وسکراتہ ۱۲

عام اسلامی ممالک

اِس وقت ان اسلامی مورخین کی انہی معلومات کو میں نے پیش کیا ہے جن کا زیادہ تر ہندوستان اور چین سے تعلق ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان مورخین نے اپنے زمانہ میں اسلامی ممالک کو جس حال میں پایا ہے اور ان کے جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ کچھ تھوڑا بہت ان کا تذکرہ بھی درج کر دوں۔

جنّات وانہار کا مذاقِ عام اور اس کا عجیب منشا

اس قسم کے تمام سیّاحوں (مثلاً الہمدانی، ابن حوقل، ابن خردادبہ، المقدسی وغیرہ) سب ہی کی کتابوں میں اسلامی ممالک کے متعلق ہم جس چیز کو بطورِ قدرِ مشترک کے پاتے ہیں وہ جنّات (باغوں) اور انہار کا تذکرہ ہے۔ مشکل ہی سے کسی ملک کا ذکر ان لوگوں نے کیا ہے جس میں وہاں کے باغات، بہتی ہوئی نہروں، جاری چشموں کا اور وہاں کے سرد و سُبک پانی کے ذکر کو انہوں

نے ترک کیا ہو۔ اِلّا ما شاء اللہ۔ آج انہی اسلامی علاقوں کا جو حال ہے اسکو دیکھتے ہوئے سچ تو یہ ہے کہ ان سیاحوں کے بیان پر اعتماد کرنا دشوار ہے لیکن روایت ایک دو آدمی کی جھٹلائی جا سکتی ہے۔ سب ہی جھوٹ بولتے تھے اور سبھوں نے غلط بیانیوں سے کام لیا ہے یہ فیصلہ بھی تو آسان نہیں ہے۔

خدا ہی جانتا ہے کہ اپنے مذہب کے ان شدید معتقد مسلمانوں پر جنّات وانہار کا یہ مذاق کیسے غالب آ گیا تھا۔ المقدسی نے اپنی کتاب احسن التقاسیم میں فارس کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بیان کرنے کے بعد کہ آجکل اس علاقہ پر دیلم کے بنی بویہ کی حکومت ہے۔ مشہور دیلمی بادشاہ عضد الدولہ کے شاہی محل[1] اور اسکے متعلقہ جنّات وانہار کی تفصیل کے سلسلہ میں ایک دلچسپ اپنا خود زائیدہ نکتہ یہ درج کیا ہے۔ یعنی یہ سوال اٹھاتے ہوئے کہ اس قسم کی نہروں اور باغوں کا یہ خیال ان لوگوں میں کس راہ سے پیدا ہوا؟ جواباً اپنی یہ توجیہ پیش کی ہے کہ۔

واظنہ بناہ لما علے	میں خیال کرتا ہوں کہ جنت کے متعلق جو خبریں
ما سمع من اخبار الجنۃ	ان لوگوں نے سنی ہیں انہی خبروں نے ان باغوں اور
(احسن التقاسیم ص۴۴۹ مقدسی)	نہروں کا خیال ان میں پیدا کیا۔

---

[1] مقدسی نے اس شاہی محل کی براہ راست خود سیر کی تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے تین سو ساٹھ محل بنوائے ہیں۔ سال کا ہر دن ایک خاص محل میں گذارتا ہے۔ ہر محل دو منزلوں پر مشتمل ہے۔ ایک بالائی اور دوسری تحتانی (باقی اگلے صفحے پر)

جس کا مطلب گویا یہی ہوا کہ ان مسلمانوں میں جنات و انہار کے عمومی ذوق کو قرآن ہی نے پیدا کیا تھا۔

مقدسی ہی نے لکھا ہے کہ:۔

عضد الدولہ کے ان محلات کو دیکھ کر عام آدمی تو آزمائش

(بقیہ حاشیہ سابق) ہر محل کی تحتانی منزل میں میلوں دور سے نہریں کاٹ کر لائی گئی ہیں، اور محل کے مختلف کاشانوں اور حصوں میں نہایت تیزی سے بہتی رہتی ہیں، اسی طرح چھ میل دور ایک ندی سے نہر کاٹ کر لائی گئی ہے اور نلوں کے ذریعہ انکا پانی بالائی منزل کی عمارتوں میں دوڑایا گیا ہے، پنکھوں پر اوپر سے ان نہروں کا پانی گرتا رہتا ہے اور انکو ہمیشہ تر رکھتا ہے، اس شاہی محل کے ہر کمرہ کا رنگ الگ ہے کسی پر چلینی کے برتن جیسا کام ہے کسی کا رنگ پتھر کے مانند ہے۔ کوئی ان میں سنہرا ہے کسی کا رنگ نقرئی ہے۔ ان تین سو ساٹھ محلوں میں ہر محل اپنی وضع قطع شکل و صورت فرش فروش ساز و سامان میں دوسرے سے قطعاً علیحدہ ہے اور ہر ایک کو گھنے باغات گھیرے ہوئے ہیں جن میں دنیا بھر کے نوادر میوے اور پھل لگے ہیں۔ ان ہی محلوں میں ایک ایوان کتابوں کیلئے مختص ہے۔ اسکے لئے ایک خازن ایک مشرف ایک کلید بردار اور ایک ناظر مقرر ہے اس وقت تک دنیا میں جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں ان کا ایک ایک نسخہ یہاں مہیا کیا گیا ہے کتب خانہ کا یہ محل بڑا طویل و عریض پلاسٹر کیا ہوا ہے جن میں الماریاں ہیں اور ترتیب سے کتابیں رکھی گئی ہیں، ہر فن کی کتابوں کا کمرہ الگ ہے، کتابوں کی مفصل فہرستیں بھی بنی ہوئی ہیں۔

(احسن التقاسیم ص ۴۴۹)

میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جو صاحبِ علم و معرفت ہیں اُن کے
قلوب میں جنّت کا شوق زیادہ تیزی کے ساتھ بھڑک اٹھتا ہے "

بصرہ کی نزہت گاہیں

بہرحال وجہ کچھ بھی ہو اس عہد کے مسلمانوں پر "جنّات وانہار" کا ذوق کس حد تک غالب تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بصرہ جو ظاہر ہے کہ براہِ راست مسلمانوں کا خاص آباد کیا ہوا شہر تھا۔ ابن حوقل نے یہ لکھتے ہوئے کہ:-

"اس شہر کی نہروں وغیرہ کا حال جب میں سُنتا تھا تو دل ماننے پر
آمادہ نہیں ہوتا تھا لیکن مشاہدہ کے بعد میں نے اس کو جو کچھ پایا
ہے اُسکو کیسے نہ بیان کروں "

پھر اپنی چشم دید رپورٹ اس نے درج کی ہے جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ:-

"اس علاقے میں عبداسی سے عبادان تک جو ڈیڑھ سو میل کی
مسافت کم و بیش ہوگی گھنے اور گنجان نخلستان ہیں۔ ایسے نخلستان کہ
آدمی اس علاقے کے جس حصے میں بھی ہو اپنے آپ کو کسی نہر کے کنارے
کسی نخلستان ہی میں پائیگا۔ اور ان تمام علاقوں میں تھوڑی تھوڑی
دور پر آرام گاہیں اور نشستگاہیں مسلسل ملتی چلی جائیں گی جیسی اور
خوبصورت، درمیان میں پرفضا نزہت انگیز میدان ہیں
جن میں طرح طرح کے فواکہ، اثمار اور پھل پھول بھرے ہوئے
ہیں، بڑے بڑے تالاب ہیں۔ تم لوگوں کو پاؤ گے کہ انہی سیرگاہوں میں

ٹہل اور پھر رہے ہیں۔ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ کوئی اوپر سے نیچے کی طرف آ رہا ہے، کچھ نیچے سے اوپر کی طرف جا رہے ہیں، دُور دُور تک اس خطہ میں نہ پہاڑ ہیں اور نہ ٹیلے، ایک مسطح میدان ہے جو درختوں سے بھرپور ہے۔ اسی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے آثار ہیں۔ جمل کا واقعہ اسی علاقہ میں ہوا تھا۔ اسی میں شہر کے اندر حضرت طلحہؓ کا مزار ہے اور شہر کے باہر حضرت انسؓ[1] کی قبر ہے، حسن بصریؒ کی، ابن سیرین کی اور

---

[1] حضرت انسؓ بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ خادم خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں بصرہ میں ان کا باغ مشہور تھا اسی میں آپ کا قصر بھی تھا۔ طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ حضرت انس کے اس باغ میں ایک پھول ہوتا تھا اسکی خوشبو مشک کے خوشبو جیسی تھی۔ طبقات ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کے اس باغ میں طرح طرح کی ترکاریاں اور سبزیاں بھی ہوتی تھیں۔ جنہیں عموماً آپ احباب میں تقسیم فرماتے تھے۔ آپکے اس باغ کے متعلق عموماً ان ہی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ سال میں دو دفعہ فصل اس میں آتی تھی سمجھا جاتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس کو جو دعا دی تھی یہ اُسکی برکت تھی لیکن آہ آج وہی بصرہ ہے۔ وہی آسمان۔ وہی زمین۔ اجاڑ میدان "شئی من سدر قلیل" کی سی کیفیت ہے۔ اور ایک بصرہ ہی کیا سارے عراق کا یہی حال ہے، امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ جرمنی کے ایک بہت بڑے انجنیئر نے مجھ سے ایک دفعہ بیان کیا تھا کہ عراق کی سیر میں نے جب کی تھی تو ہارون الرشید کے زمانہ کی ایک نہر جو اب برباد شدہ حال میں ہے دیکھکر متحیر رہ گیا اس نے کہا کہ اتنی طویل اور اتنی عمیق نہروں کا بنانا موجودہ زمانہ کی متمدن حکومتوں کے بس کی بھی بات نہیں ہے ۱۲

دوسرے علمائے بصرہ کی قبریں ہیں۔ اُبلہ کی نہر بھی ہے جس کا طول بارہ میل کے قریب ہے۔ بصرہ سے اُبلہ تک نہر کے دونوں جانب باغات اور بڑے بڑے محل بنے ہوئے ہیں سب ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں اور اس طرح ملے جلے ہیں کہ گویا ایک باغ ہے جسے ڈوری سے ناپ کر کسی نے لگایا ہے۔ پھر اس نہر سے بھی شاخیں پھوٹی ہیں۔"

بصرہ کے اس علاقے میں ابن حوقل نے لکھا ہے کہ:۔

"ایک لاکھ بیس ہزار نہریں جاری تھیں انہیں سے ایک ہزار نہروں کی وسعت اتنی تھی کہ باسانی ان میں کشتیاں چلتی تھیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے ان اولوالعزمیوں کا جو ان نہروں کے کھدوانے والوں میں کارفرما تھیں۔ اور ان کے کنارے بھی درختوں کا یہی حال ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب ایک دن نصب کیے گئے ہیں۔ (ص۱۶۱)

بخارا اور ماوراء النہر وغیرہ کی زرخیزی

اور عراق جو نسبتاً ایک خشک علاقہ ہے جب مسلمانوں نے کسی زمانہ میں اسے ایسا باغ و بہار بنا رکھا تھا اسی سے اندازہ ان سرد سبز اور گرم سیر علاقوں کا ہو سکتا ہے جو ایران و خراسان ترکستان وغیرہ میں واقع تھے جن کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ اپنی کتاب "ہمارے علمی گہوارے" میں کروں گا۔ اس وقت صرف ابن حوقل کی ان چند سطروں کا ترجمہ کر دینا کافی ہوگا جو اسنے

بخارا اور سمرقند کے متعلق اپنے تاثرات کو قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"تم بخارا کے قلعہ پر چڑھ جاؤ اور اسکے بعد اپنی نظر کو جولانی دو۔ دُور دُور تک نگاہ دوڑاؤ۔ بجز سرسبزی اور ہریالی کے تمہیں کوئی چیز نظر نہ آئے گی۔ ایسی سرسبزی آسمان کے رنگ سے جس کا رنگ مل جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیلا شامیانہ کسی سبز فرش پر تنا ہوا ہے اور بخارا کے قصور و محلات ان کے بیچ میں کچھ ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ ستارے جگمگا رہے ہیں، ایک ایسی زمین جس میں نہ نشیب ہے نہ فراز جیسے آئینہ کی سطح"۔ پھر کچھ اور چیزوں کا تذکرہ لکھنے کے بعد وہی لکھتا ہے کہ:۔

"بخارا سے دریائے سغد کی وادی کی طرف چلے آؤ۔ دائیں بائیں مسلسل تمہیں آبادیاں کوہ منتہٰم تک ملی جلی نظر آتی چلی جائیں گی ایسی آبادیاں جن کے چاروں طرف سبزہ زار محیط ہے۔ ان کی تروتازگی کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ یہ آٹھ دن کا راستہ ہے قطعاً ایکدوسرے کے ساتھ گتھے ہوئے اشجار، باغات، بساتین میدان جنہیں نہروں نے گھیر رکھا ہے، ایسی نہریں جو ہمیشہ جاری رہتی ہیں، بیچ بیچ میں ان ہی باغوں اور مرغزاروں کے بڑے بڑے تالاب جن میں پانی چھلکتا رہتا ہے۔ کھیتیاں ہیں کہ جدھر نظر اٹھاؤ، لہلہاتی معلوم ہونگی۔ جو دریائے سغد کے دونوں کنارے پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر ان کھیتوں کے پیچھے پیچھے چراگاہیں ہیں۔ اور

درمیان درمیان میں اونچے اونچے قصور محلات قلعے ہر شہر اور ہر گاؤں پر آبادی کے متعلق ملتے چلے جائیں گے اور ان کی وجہ سے اس علاقے کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سبز دیبا کے کپڑے کے ساتھ ان بہتی صاف شفاف۔ شیریں نہروں کو کسی نے سی دیا ہے۔ اس علاقہ کے باشندوں کے گھروں میں اور ان کے باغات میں یہی نہریں گھومتی رہتی ہیں۔ کوئی سڑک کوئی بازار کوئی سمت، کوئی قصبہ اسمیں ایسا نہیں ہے جسمیں ان نہروں کا پانی نہ دوڑ رہا ہو اور سامنے کوئی حوض پانی سے بھرا ہوا نہ چھلک رہا ہو۔ یہی حال فرغانہ، شاش، اشروسنہ اور سارے ماوراالنہر کا ہے کہ گھنے درختوں سے وہ بھرا ہوا ہے۔ جن میں طرح طرح کے فواکہ، میوے، پھل پھول ہیں۔ ترکستان کے پہاڑوں تک یہی حال ہے۔ انگور، اخروٹ، سیب اور دوسرے فواکہ گلاب بنفشہ اور طرح طرح کے پھول بکثرت نظر آئیں گے۔ پہاڑ کے قریب تو پھر ان کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے جس کا جی چاہے کھا سکتا ہے۔ توڑ سکتا ہے۔ نہ کوئی روکنے والا نہ ٹوکنے والا ہیں نے ماوراالنہر کیا انہی پہاڑوں میں دیکھا کہ پستے کے درختوں کی وہ کثرت ہے کہ انکی وہاں کوئی قیمت ہی نہیں جس کا جی چاہے مفت جتنا چاہے لے سکتا ہے۔ یہاں ہیں نے

گلاب کے بھی طرح طرح کے پھول دیکھئے جو خریف کے آخر موسم تک
باقی رہتے ہیں۔ ان کی پنکھڑیوں کی بیرونی سطح کا رنگ کچھ اور
ہوتا ہے اور اندرونی کا کچھ اور۔ اگر بیرونی سطح سرخ
ہے تو اندرونی زرد۔ باہر والی نیلی ہے تو اندرونی پیلی ہے"
(ابن حوقل ص۲۴۳)

صحرائے افریقہ میں آبپاشی کے ذرائع

اور ایران، ترکستان، خراسان وغیرہ کو تو جانے دیجئے۔ یہاں کے قدرتی
ذرائع سے مسلمانوں نے اگر نفع اٹھایا تو محلِ تعجب نہیں۔ حیرت تو اس پر
ہوتی ہے کہ مغربی افریقہ کے جہنمی منطقۂ حارہ مثلاً سجلماسہ اور غشت وغیرہ
دُور دراز علاقوں کو بھی اپنے اسی نہری اور آبی ذوق سے باغ و بہار بنا رکھا
تھا۔ ابن حوقل الجزنامی ایک آبادی کا جو اسی علاقہ میں ایک پہاڑ پر حکومت
ادریسیہ کی قائم کی ہوئی تھی اس کے متعلق لکھتا ہے کہ:۔

"یہ ایک نو تعمیر بڑا شہر ہے۔ ایک بلند اونچے پہاڑ پر آباد کیا گیا ہے
آلِ ادریس والوں نے اسکو بسایا ہے۔ یہاں ان لوگوں کا ایک قلعہ
بھی ہے۔ اسی قلعہ میں ان کے مملوکات محفوظ ہیں۔ اس شہر کی
ان کی نظر میں بڑی قدر و منزلت ہے۔ خطروں سے سمجھا جاتا
ہے کہ محفوظ ہے"۔

بہرحال مغربی افریقہ کے اس بر سر کوہ آبادی کے پانی کا تذکرہ کرتے ہوئے

ابن حوقل راوی ہے کہ:۔

"یہاں بھی مختلف چشموں سے نہریں جاری ہیں اور باغات و بساتین ان ہی نہروں سے سیراب کئے جاتے ہیں"۔

اس نے لکھا ہے کہ:۔

"بڑے وسیع پیمانہ پر یہاں زعفران کی کاشت ہوتی ہے۔ بلکہ اسی شہر کے قریب اریس نامی جو جگہ ہے وہاں کی پیداوار صرف زعفران ہے"۔ (صـ۶۱)

اسی مغرب اقصیٰ کے ایک اور دور دست پہاڑی شہر جس کا نام جبل نفوسہ ابن حوقل نے بتایا ہے۔ حالانکہ اسکی چڑھائی جلیسا کہ اسی نے لکھا ہے کامل تین دن کی ہے۔ لیکن پہاڑ پر پہنچنے کے بعد اس نے دیکھا کہ:۔

"پانی کی نہروں کا جال وہاں بھی بچھا ہوا ہے۔ شہر کے اطراف میں بڑے بڑے تاکستانوں سے معمور رہیں۔ جن میں بہترین انگور لگتے ہیں اور انجیر بھی اس علاقہ کے حد سے زیادہ پُر مغز ہیں"

اسی شہر کے ذکر میں اُسنے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"زراعت یہاں صرف جَو کی کرتے ہیں۔ مگر اس جَو کو بھی مسلمانوں نے خدا ہی جانتا ہے کس ترکیب سے اس مرتبہ پر پہنچا دیا تھا کہ ابن حوقل گواہی دیتا ہے"۔ جب اسکی روٹی پکائی جاتی ہے تو سارے جہان کے کھانوں میں اس روٹی کو میں نے لذیذ ترین غذا پایا، میں نے روئے زمین پر اسکی نظیر نہیں دیکھی"۔ (صـ۶۸)

شہروں میں آب رسانی کے طریقے

مسلمان شہروں اور آبادیوں میں پانی لانے کے متعلق کن کن تدبیروں سے کام لیتے تھے اس کا اندازہ ان بیانات سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً نیشا پور کے تذکرے میں ابن حوقل نے لکھا ہے کہ:-

"اس شہر میں پانی زیر زمین نالیوں کی راہ سے لایا گیا ہے۔ یہ نالیاں باشندوں کے مکانوں کے نیچے نیچے بنائی گئی ہیں پھر شہر والوں کی ضرورت کو پوری کر کے نہر شہر سے باہر نکل جاتی ہے اور ان کشت زاروں اور باغوں میں گم ہو جاتی ہے جو شہر کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں"۔

پھر آگے لکھا ہے کہ:-

"نیشا پور والوں کے پاس سفادر نامی ایک بڑی نہر بھی ہے اس سے اطراف و نواحی کے باشندوں کی ضرورت پوری ہوتی ہے"۔

اُسی کا بیان ہے کہ:-

"جن زیر زمین نالیوں سے پانی کی سیرابی ہوتی ہے اُنکی حفاظت و نگرانی کیلئے باضابطہ ایک عملہ مقرر ہے"۔

اسی نیشا پور کی زیر زمین نالیوں کے ذکر میں اُس نے لکھا ہے کہ:-

"بعض بعض مقامات پر ان کی گہرائی سو سو درجے تک پہنچ گئی ہے"۔ (ص ۳۱۲)

اسی طرح مرو مشہور خراسانی شہر کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"دریائے مرغاب سے نہریں کاٹ کر شہر تک پانی لایا گیا ہے پانی کی تقسیم کا ایک مرکز ہے اسی مرکز سے شہر مرو کے ہر ہر محلہ اور ہر بازار میں پانی تقسیم ہوتا ہے۔ جہاں سے لوگ پانی پیتے ہیں اس کے دہانے پر سوراخ کئے ہوئے لکڑی کے تختے لگے ہوئے ہیں کچھ ایسی تدبیر اختیار کی گئی ہے کہ مقررہ مقدار سے پانی کی آمد نہ گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے"۔

ابن حوقل کا بیان ہے کہ:۔

"دس ہزار آدمی پانی کے سربراہی کے اس طریقے پر کام کرتے ہیں۔ ان کا افسر مرتبہ میں والی (گورنر) شہر سے کم نہیں ہے سردیوں میں موم لگا کر لوگ مرمت کیلئے نہر کی شاخوں میں گھستے ہیں"۔ ص ۳۱۵

اور میلہا میل سے آبادیوں تک پانی لانا، ان کو بلند سے بلند مقام تک پہنچانا یہ تو اس زمانہ میں اسلامی شہروں کی ایک عام رسم معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ تو میں نے بطور مثال کے نقل کیا ہے ابن حوقل کے قلم کی رفتار کا یہی حال قریب قریب دوسرے ایرانی وخراسانی وسیستانی شہروں اور آبادیوں کے ذکر میں بھی پایا جاتا ہے۔ آخر میں اس نے ان چیزوں کو لکھنے کے بعد یہ بھی لکھدیا ہے کہ:۔

"مشرق کے متعلق مجھے جو کچھ لکھنا تھا بس یہ اسکی آخری حد ہے

جہاں اسلامی ممالک کے حدود ختم ہوتے ہیں اور انشاءاللہ میں نے جو کچھ ارادہ کیا تھا اس میں میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور جہاں تک میں اپنے نزدیک سمجھتا ہوں محض گرمئی بزم اور زینت کلام کیلئے یا کسی علاقہ کی مذمت اور تحقیر کیلئے کسی مبالغہ سے یا خلاف بیانی سے میں نے کام نہیں لیا ہے "

اپنے شوقِ سیاحت کی نسبت ابنِ حوقل کا بیان

"یہ جو کچھ میں نے کام کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائے جوانی سے مجھے اس کا شوق تھا کہ مختلف ممالک کے حالات کا علم حاصل کروں۔ اس لئے ان لوگوں سے جو سیر و تفریح میں عموماً رہتے ہیں یا تجارت کے سلسلہ میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں اُن کی آمد و رفت ہے ملکوں کے حالات دریافت کیا کرتا تھا۔ نیز اس موضوع پر اب تک جو کتابیں تالیف ہوئی ہیں ان کا مطالعہ بھی کیا کرتا تھا۔ شروع میں میرا حال یہ تھا کہ جس آدمی کو سچا سمجھ کر اس سے ملاقات کرتا اور خیال کرتا کہ وہ ان علاقوں کا بڑا واقف کار ہے لیکن بعد کو دیکھا کہ انہیں زیادہ تر غلط بیانیوں سے لوگ کام لیتے ہیں اور جن باتوں کی وہ خبریں دیتے ہیں اُن سے یہ خود عموماً ناواقف ہوتے ہیں جس کا پتہ مجھے یوں چل جاتا تھا کہ جو کچھ جس کسی سے سن لیتا تھا

اُسے اچھی طرح ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا۔ پھر ان روایتوں کو ملاتا تو بکثرت ان بیانوں میں مجھے تضاد محسوس ہوتا ۔"

لکھا ہے کہ اس تجربہ کے بعد :۔

"مجھ پر یہ شوق مسلط ہوا اور دل ہی دل میں اس عزم کو پختہ کرنے لگا کہ میں خود سفر کروں گا اور خطرات جو پیش آئیں گے اُن کے برداشت کرنے کیلئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا کیونکہ میں کرۂ زمین اور ان کے مختلف حصّوں کا ایک صحیح نقشہ تیار کرنا چاہتا تھا۔"[1]

روایات کی تنقید کا جو معیار اس نے خود مقرر کیا ہے اسمیں ایک دلچسپ فقرہ

---

[1] زمین کی نقشہ کشی کا ذوق مسلمانوں میں شروع ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ تک کے عہد سے اسکا پتہ چلتا ہے۔ الہمدانی نے لکھا ہے کہ دیلم پر جب حجاج کے زمانہ میں چڑھائی ہوئی تو حجاج نے حکم دیا کہ دیلم کے علاقہ کا نقشہ کھینچکر مجھے بھیجا جائے یعنی اسکے پہاڑ اور میدانی علاقے بلند اور پست خطے، اسکے جنگل، اس کے راستے۔ پس اسکا نقشہ بنا کر حجاج کو بھیجا گیا۔ مسلمانوں نے اس فن پر جو کام کیا ہے اُسکی داستان تو طویل ہے اور عام طور پر مشہور بھی ہے۔ ادریسی کا مشہور چاندی کا کرہ جس میں زمین کے چپّہ چپّہ کا پتہ دیا گیا تھا حتیٰ کہ لوگوں کا بیان ہے کہ امریکہ کا بھی اسی نے پتہ دیا تھا۔ خود ابن حوقل نے بھی کرۂ ارض کا اٹلس بنایا تھا لیکن افسوس ہے کہ اسکی کتاب کے ساتھ وہ طبع نہیں ہوا۔ وہ ہر جگہ اپنے اٹلس کا حوالہ دیتا ہے۔ خصوصاً ایک جگہ سے دوسری جگہ کی سمت اور فاصلہ کی تو اسنے پوری فہرست بھی دی ہے جو موجودہ کتاب میں بھی محفوظ ہے۔ ۱۲

اس کا یہ ہے۔ عربی کے بجنسہٖ الفاظ ہی میں اُسکا لطف کچھ زیادہ مل سکتا ہے۔
ایک روایت کی تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

لان المنکر	نہ جاننے اور ناواقفیت کی وجہ سے
لما لا یعلم	کسی چیز سے انکار کرنے والے کا عذر
اعذر من	زیادہ پذیرائی کا مستحق ہے بہ نسبت اس
المقر بما یجہل	شخص کے جو خواہ مخواہ ان چیزوں کو
(ص ۳۳)	مانتا چلا جاتا ہے جن سے وہ ناواقف اور جاہل ہے۔

منطقیوں کا مشہور فقرہ کہ "عدم العلم متلزم علم العدم" نہیں ہے"۔ یعنی کسی چیز سے ناواقف ہونے کا مطلب یہ غلط ہے کہ اُس چیز کے نہ ہونے کا دعویٰ کر لیا جائے۔ اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ بجائے خود یہ بھی ایک بہترین فکری مشورہ ہے کہ اور روشن خیال مدعیوں میں زیادہ تر اسی کا مرض پھیلا ہوا ہے۔ عموماً ان ہی چیزوں کے منکر ہیں جن سے وہ ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں۔ اپنی ناواقفیت ہی کو وہ اُس چیز کے نابود ہونے کی دلیل بنا لیتے ہیں۔ جن سے وہ ناواقف ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ دوسری طرف بھی ایک قسم کی وہی زیادتی پائی جاتی ہے۔ جسکی سب سے اچھی تعبیر مجھے ابن حوقل ہی کے یہاں ملی یعنی ہر مجہول اور نامعلوم شئے کے مان لینے والوں سے یقیناً وہ زیادہ اچھا ہے جو یہ کہتا ہے کہ جب تک مجھے وہ چیز معلوم نہ ہو جائے خواہ مخواہ اس کا اقرار کیوں کروں"۔

عربوں کی چاول سے واقفیت کا عجیب واقعہ

بہرحال ابن حوقل کی روشن خیالی اور سخت تنقیدی نظر کا اندازہ آپ کو اس کے مذکورہ بالا عمل اور اصول سے ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے مسموعات نہیں بلکہ براہِ راست مشاہدات کے متعلق شک کرنے یا شاعری قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ اخلاف کو دیکھ کر اُن اسلاف کے مذاق کا پتہ چلانا قطعاً ایک گمراہ کن طریقہ استدلال ہوگا۔ انہار و اشجار کے سلسلہ میں ایک چیز کا خیال آگیا یعنی چاول! ظاہر ہے کہ عرب چاول یا دھان سے گویا قریب قریب ناواقف ہی تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے اُرز کے لفظ سے ان کے کان ضرور آشنا تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "الارز" کا ذکر اپنی ایک حدیث میں فرمایا ہے۔ بخاری کی روایت جس میں غار میں گرفتار ہونے والے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے مگر خود چاول کو مسلمان سپاہیوں نے پہلی دفعہ جب دیکھا تو بلاذری نے یہ عجیب لطیفہ اس کے متعلق نقل کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ:

"بصرہ جہاں پر آج کل آباد ہے یہاں پہلے ایک جنگل تھا اور عموماً اسکو "ارض الہند" کہتے تھے۔ غالباً ہندوستان کے جہازوں کے ٹھہرنے کی جگہ قدیم زمانہ سے اسی جنگل کے قریب ہوگی۔ اس جنگل میں کچھ چور چھپے ہوئے تھے۔ اسلامی فوجیوں کو دیکھ کر راہِ فرار اختیار کی، اور دو تھیلیاں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جن میں

ایک تھیلی چاول کی تھی۔ عربوں نے نئے قسم کے دانے دیکھ کر خیال کیا کہ شاید کوئی زہریلی چیز ہے۔ جو افسر تھا اس نے حکم دیدیا کہ کوئی ان کو ہاتھ نہ لگائے۔ تھیلی کا منہ کھلا ہوا تھا۔ رات کو اتفاقاً کسی سپاہی کا گھوڑا کھل گیا۔ اور اسی بوری کی طرف نکل آیا۔ جس میں چاول رکھے ہوئے تھے۔ گھوڑے نے اس میں منہ مار دیا۔ پیچھے سے اس کا مالک بھی پکڑنے کے لئے چلا آ رہا تھا۔ یہ دیکھکر کہ زہر کی تھیلی میں اس کے گھوڑے نے منہ مارا ہے۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور انتظار کرنے لگا کہ صبح تک بیچارے کی موت یقینی ہے۔ دوسروں کو بھی اس کی خبر ہوئی اور سب اسکی موت کے انتظار میں رات گذارنے لگے لیکن صبح تک دیکھا گیا کہ اس پر زہر کے آثار تو کیا طاری ہوتے بالکل بھلا چنگا ہے۔ لید بھی اچھی طرح سے ہوئی اور پیشاب بھی اس نے خوب کیا۔ تب دم میں دم لوگوں کے آیا۔ اور اب خیال بدلا سمجھا گیا کہ کوئی کھانے ہی کی چیز ہے۔ پانی ڈال کر ہانڈی میں چاول کو چڑھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں پھول کی طرح کھلے ہوئے چاول ان کی نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ پھر بھی ڈرتے ڈرتے لوگوں نے ابتدائی نوالے اٹھائے۔ لیکن کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تو بڑی لذیذ غذا ہے۔ تب یقین ہوا کہ یہ تو کوئی غذائی شے ہے۔

(البلدانی صفحہ ۱۸۸)

لیکن حال ہی میں الہلال مصر میں ایک مضمون "الارز" پر شائع ہوا تھا
جسمیں اسی چاول کی تاریخ درج کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس دانے سے واقفیت
چین والوں کو حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار آٹھ سو سال پہلے ہو چکی تھی۔
چین میں اس غلّہ اور اسکی کاشت کو جو اہمیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس
سے کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہ وقت کاشت کے وقت کھیت پر خود پہنچا
کرتا تھا اور دھان کے چند پودے اپنے ہاتھ سے بطور شگون نیک کے لگاتا۔
تب اسکے بعد دوسرے لوگ کام شروع کرتے تھے اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ چاول
بالکلیہ ایک مشرقی غلہ ہے اور مشرق ہی سے یہ مغرب پہنچا ہے لیکن جانتے ہو
مشرق سے مغرب لیجانیوالے اسکے کون ہیں؟ ان ہی کی اولاد جنہوں نے پہلی
دفعہ چاول کو دیکھکر سمجھا تھا کہ یہ کوئی زہریلی چیز ہے۔ "الہلال" ہی میں لکھا تھا کہ

"سب سے پہلے اس اناج کو یورپ مسلمان لے گئے۔ انہوں ہی
نے اندلس میں چاول کی کاشت کو مروج کیا ہے اور پھر
بتدریج دوسرے علاقوں میں بھی اسکی کاشت ہونے لگی" (الہلال مئی ۳۵)

اور کیا چاول ہی ایک چیز ہے جسے مسلمانوں نے ایک ملک سے دوسرے ملک تک
پہنچایا ہے ایک طویل فہرست اس سلسلہ میں تیار ہو سکتی ہے۔
بہر حال مجھے تو صرف اسکی مثال دینی تھی کہ ابھی ابھی جس چیز سے مسلمان ڈرے تھے افادہ کے
احساس کیساتھ اسکے مبلغ بن گئے اور زندہ قوموں کا یہی دستور ہوتا ہے یہی وجہ ہے
جو مجھے ان مورخین کے بیانوں میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ جب وہ مسلمانوں

کی ان اولوالعزمیوں کو بیان کرتے ہیں جو آج اُن کے جانشینوں کو دیکھ دیکھ کر کچھ ناقابلِ مفہوم باتیں بنتی چلی جارہی ہیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون

زراعت و باغبانی میں مسلمانوں کی حیرت انگیز ترقی

رُوس کی تازہ دم نئی شیوعی حکومت شورائیہ کی داستانوں کے سُنانے والے عموماً آج یہ سُنا رہے ہیں کہ مختلف اناجوں کے پودوں کے ساتھ عمل تقلیم و تطعیم سے کام لے کر رُوسی گیہوں کے ایسے پودوں کے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو مسلسل کئی سال تک اسی طرح پھلتے رہتے ہیں۔ جیسے پھل والے درختوں میں ہر سال پھل لگتے ہیں لیکن صدیوں پہلے بھی ابن حوقل ہمیں یہ پرانی داستان سجلماسہ کے مسلمانوں کے متعلق سُناتا ہے کہ ایک قسم کا غلّہ جس کے متعلق اس کے الفاظ ہیں "خلقۃ بین القمح والشعیر" یعنی جس کی شکل و صورت گیہوں اور جو دونوں سے ملتی جلتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ان دونوں کے پودوں کی تطعیمی عمل سے یہ نتیجہ پیدا کیا گیا تھا یا کیا واقعہ تھا۔ تاہم نتیجہ اس کا جو ہوا تھا اُسے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے کہ:

وربما زرعوا سنۃ بذروحصدوہ سبع سنین بسنبل لایشبہ سنبل الحنطۃ ولا الشعیر (ابن حوقل ص۶۵)	بسا اوقات اس غلے کے تخم کو ایک سال بوتے ہیں اور سات سال تک کاٹتے رہتے ہیں ایسے خوشے اس کے ہوتے ہیں جو نہ گیہوں ہی کے خوشوں سے مشابہ ہیں اور نہ جو ہی سے۔

ابنِ حوقل جس نے خود بھی اس غلے کو استعمال کیا تھا لکھتا ہے کہ:۔

"ٹوٹنے میں تو یہ ذرا سخت ہوتا ہے لیکن کھانے میں گیہوں اور جَو دونوں سے زیادہ لذیذ ہے"

اور ابن حوقل تو چوتھی صدی ہجری کا آدمی ہے۔ تیسری صدی ہجری میں ہی مسلمانوں نے تقلیم و تطعیم کے فن کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ مصری امیر خمارویہ کے باغ میں مقریزی نے لکھا ہے کہ دوشمش کے درخت کا بادام کے درخت سے اور بھی مختلف قسم کے پھلوں کے درختوں کی تقلیم دوسرے جنس کے درختوں سے کرکے نئے نئے پھل اتنے پیدا کئے تھے جنہیں دیکھکر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی (صلـ۳۶ ج ۱)

عمل تابیر یعنی نر درختوں کے پھول کو مادہ درختوں کے گچھوں میں منتقل کرنا۔ کھجور کی حد تک تو اسلام سے پہلے اس عمل کو عرب بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن ابنِ حوقل نے لکھا ہے کہ مغربی افریقہ میں لوگوں کو دیکھا کہ انجیر کے درختوں پر بھی اس عمل کو کرتے ہیں (صـ۱۲۴)

اسی نے فلسطین کے شہر زغر کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہاں کے لوگوں نے کوشش کرکے ایک قسم کھجوروں کی ایسی پیدا کر لی ہے کہ ایک ایک پھل اسکا آدھ آدھ پاؤ کا ہوتا ہے اور رنگ بالکل زعفرانی۔ (صـ۱۲۴)

افریقہ کے شہر سوس کے ذکر میں اسی نے لکھا ہے کہ ایک نارنگی وہاں کے لوگوں نے ایسی برآمد کی ہے جو آدھی کف دست کی طرح چوڑی بھی ہوتی ہے اس میں انگلیوں کی طرح پانچ شاخیں نکلی ہوتی ہیں۔ (صـ۱۷۵)

فنِ باغبانی کو مسلمانوں نے نتائج کے لحاظ سے ترقی کے کن حدود تک پہنچا دیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ حال ہی میں مشہور محدّث و مفسّر علامہ شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی صاحب تفسیر روح المعانی کی چشم دید شہادت اگر مجھے نہ مل جاتی تو شاید ان قصّوں پر اعتماد کرنا میرے لئے دُشوار ہی تھا۔ صاحبِ روح المعانی جو تیرھویں صدی کے عالم ہیں انہوں نے تفسیر لکھنے کے بعد اپنے وطن بغداد سے قسطنطنیہ کا سفر دربارِ خلافت میں اسی کتاب کو پیش کرنے کے لئے براہ کردستان کیا تھا۔ انہوں نے ایک مختصر سا سفر نامہ بھی "نشوۃ الشمول فی سفر اسلامبول" عربی میں لکھا ہے۔ اس سفر نامہ میں مختلف مقامات جو راستہ میں اُنکو ملتے گئے ہیں وہاں کے بعض حالات و خصوصیات وہ درج کرتے چلے گئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں وہ آمد بھی پہنچے ہیں۔ وہاں ترکی گورنر کے مہمان تھے۔ لکھا ہے کہ گورنر صاحب کے پاس ایک دن خربزہ آیا جس کا رنگ اوپر سے سبز تھا۔ اس خربزے کی اہمیت ان ہی کی زبان سے سنئے، لکھا ہے کہ:-

"وہ اتنا بڑا تھا کہ دھوپ کی تمازت سے ٹھیک کر اس کی آڑ میں اگر کوئی بیٹھ جائے تو وہ بخوبی سایہ حاصل کر سکتا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ چاک کر کے اگر اس کو دو حصّوں میں بانٹ دیا جائے اور اندر کا مغز نکال لیا جائے تو ہر ٹکڑا اچھا خاصا حوض بن سکتا ہے۔ ایسا حوض جس میں دو قلتین کے برابر پانی سما جائے۔ اسے دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ گورنر نے مجھے

اس حال کو دیکھکر حکم دیا کہ اس خربزے کو ان کے سامنے تول کر دکھاؤ تاکہ ان کے علم میں مزید اضافہ ہو۔ اور آئندہ کامل اعتماد کے ساتھ دوسروں سے اس قصے کو بیان کر سکیں۔ بہرحال وہ خربزہ تولا گیا۔ تولنے والے نے اعلان کیا کہ پورے اٹھائیس حقّہ اس کا وزن ہے۔ اس پر مفتی صاحب جو وہیں بیٹھے ہوئے تھے بولے میں نے بھی ایک خربزے کو تولا تھا تو بارہ حقّے وہ اس خربزے سے زیادہ تھا۔ انہی مفتی صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ میں نے زرد رنگ والے خربزے کو بھی تول کر دیکھا ہے تو وہ تئیں حقے کے برابر تھا۔ اس پر احمد آفندی نے کہا کہ میں نے دس سال پہلے ایک خربزہ دیکھا تھا۔ جو ایک بڑے مضبوط اونٹ پر لدا ہوا تھا۔ اور وہی تنہا اس اونٹ کا کافی بوجھ تھا"

(نشوۃ الشمول ص۹۲)

علامہ آلوسی نے اسکے بعد لکھا ہے کہ لوگ جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ وزن ہی نہیں بلکہ مزے میں بھی آمد کے خربزے ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر اپنا تجربہ یہ بیان کیا ہے کہ چکھنے کے بعد واقعی مصری کی ڈلی اس کے سامنے شرمندہ تھی۔ آلوسی کی اسی عینی شہادت کو پڑھنے کے بعد السمدانی کی اس روایت کے جھٹلانے کی جرأت مجھ میں باقی نہیں رہی یعنی اس نے

لہ۔ حقّہ۔ یہ وہی لفظ ہے کہ مکہ معظمہ وغیرہ میں جسے "اُکّہ" کہتے ہیں۔ اس وقت مجھے پورے طور پر یاد نہیں رہا کہ حساب سے "اُکّہ" کا وزن کتنا ہے خالباً ایک سیر یا پون سیر کے مساوی ہے ۱۲

لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے پاس یمن سے حج کے موقع پر انگور کے دو خوشے آئے تھے جو اتنے بڑے بڑے تھے کہ ایک خوشہ ایک طرف اور دوسرا خوشہ دوسری طرف اونٹ پر لدا ہوا تھا۔ (الہمدانی ص ۱۲۵)

اگر آلوسی کا بیان واقعہ ہے تو ابنِ حوقل کے اس بیان میں کیوں شک کیا جائے یعنی بطوئنس میں برشک نامی جگہ میں ناسپاتیاں جنہیں سفرجل مُعنّق کہتے ہیں یعنی گردن رکھنے والی ناسپاتیاں چھوٹے کدو کے برابر ہک رہی تھیں (ص ۵۲)

شاید آجکل جن ناسپاتیوں کو "نکو گوشہ" کہتے ہیں جو ایک فرانسیسی لفظ ہے غالباً اسی قسم کی ناسپاتیوں کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن چھوٹے کدو (نہی) کدو کے برابر ناسپاتی ؟

بہرحال اس سلسلہ میں ان لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس کے نمونے کیلئے شاید یہ چند مثالیں کافی ہو سکتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی پیداوار میں مقامی خصوصیتوں کو بھی دخل ہوا کرتا ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ جن مقامات میں جن چیزوں کی پیدا ہونے کی کافی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اُن سے بھی تو لوگ نفع نہیں اُٹھاتے۔ آخر یہی مسلمان تو تھے یہی ہندوستان تھا سلاطین اور بڑے بڑے نوابوں کو جانے دیجئے۔ شاہجہانی عہد کا مشہور کیرانوی جراح جو حسنو جراح کے نام سے مشہور تھا۔ اصلی نام شیخ حسن تھا۔ کیرانہ میں جو باغ اس جراح نے لگایا تھا۔ کہتے ہیں کہ پستہ جیسے نازک درخت تک اُگانے اور سرسبز کرنے میں اسی ہندوستان میں وہ کامیاب ہوا تھا۔ مآثر الامراء میں ہے کہ:۔

باغ یک صد و چہل بیگہ را
دیوار ریختہ کشیدہ و حوضے
بذراع دو صد و بیست در
دو صد بوسط انداخت و اشجار
گرم سیر و سرد سیر ہر دو نشانید
گویند نہال پیتہ آنجا سرسبز شد
دانہ خوب ہر جا کہ شنید
از گجرات و دکن تخم آں آوردہ
کاشت (مآثر الامرا ص ۳۸۱)

ایک سو چالیس بیگہ میں اسی جراح نے باغ لگایا تھا۔ اور پورا باغ چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ باغ کے بیچ میں ایک حوض بھی بنوایا تھا جو دو سو بیس گز لمبا اور دو سو گز چوڑا تھا۔ گرم اور سرد دونوں قسم کے ممالک کے درخت اس باغ میں لگائے گئے تھے کہتے ہیں کہ پیتہ کا درخت بھی اس باغ میں سرسبز ہوا تھا۔ اور آم کے متعلق تو یہ حال تھا کہ دکن اور گجرات تک سے تخم منگوا کر نصب کئے گئے۔ جہاں کہیں اچھے آم کی خبر ہوتی منگوایا جاتا۔

ل ایک عام آدمی جب اتنی اولوالعزمی دکھا سکتا تھا تو اسلامی سلاطین کے متعلق ایسی باغبانی کے جو قصے تاریخوں میں نقل کئے جاتے ہیں اُن پر حیرت نہ ہونی چاہیئے۔ محمود بیگڑہ گجراتی بادشاہ کے حال میں لکھا ہے کہ سابرمتی ندی کے ساحل پر تین میل لمبا آموں کا باغ اس نے لگایا تھا اور سلاطین کے ان قصوں کے دہرانے کیلئے دفتر چاہیئے۔ ابن طولون امیر مصر کے بیٹے خمارویہ جو تیسری صدی میں باپ کے بعد مصر کا گورنر امیر تھا مقریزی نے لکھا ہے کہ اپنے باغ میں سارے جہان کے پھلوں اور پھولوں کے اُگانے کی اس نے کوشش کی تھی۔ صرف کھجوروں کے سلسلے میں ایک قسم ایسے درختوں کی تھی جنکا قد جوان ہونے اور پھلنے پھولنے کے بعد بھی اتنا اونچا ہوتا تھا کہ بیٹھے بیٹھے آدمی ان کے پھلوں کو ہاتھ سے توڑ سکتا تھا۔ کھجور کے ان درختوں کے تنوں پر اس نے سونے کے

(باقی اگلے صفحے پر)

اشیاء کی ارزانی اور عام فراغ بالی

کرمان جو تمام ایران میں اپنی خشکی اور زمین کی خرابی کی وجہ سے بہت زیادہ بدنام ہے لیکن ابنِ حوقل نے لکھا ہے کہ ہم جس زمانہ میں وہاں پہونچے تو کھجور جو زیادہ تر عرب اور عرب کے گرد و نواح کا درخت ہے اس کی اتنی کثرت اس علاقے میں دیکھی کہ بسا اوقات ایک ایک درہم میں سو سو من تک کھجور وہاں بک جاتی ہیں من سے مراد ہندوستانی من نہیں ہے بلکہ وہ اس سے کچھ علیحدہ ہی وزن ہے۔ مختلف علاقوں میں اسکی نوعیت مختلف تھی۔ لیکن سیر ہی سمجھ لیجئے۔ ایک درہم میں سو سیر کھجور۔ لطیفہ یہ لکھا ہے کہ خود درختوں سے ہو لگے جھونکے

باغ پھلا ملمع کئے ہوئے تانبے کے خول چڑھوا دیئے تھے جنکے اندر سیسے کی نالیاں لگی ہوئی تھیں پانی انہی اندرونی نالیوں میں چڑھایا جاتا تھا اور اوپر پہنچکر وہی پانی پھر باہر کی طرف ابلتا تھا۔ سارے باغ کی سیرابی اسی طریقے سے ہوتی تھی۔ اس باغ میں وہ زعفران کی کاشت کرانے میں بھی کامیاب ہوا تھا۔ پھولوں کا چمن ایک خاص نظام کے تحت لگایا گیا تھا۔ یعنی ایسی ترتیب قائم کی گئی تھی جس سے مختلف نام ان پھولوں کی اس ترتیب سے بن جاتے تھے یا مختلف قسم کے نقوش قائم ہو گئے تھے۔ مالی ان کی پنکھڑیوں اور پتّوں کو ہموار رکھنے کی ہمیشہ نگرانی کرتے رہتے تھے۔ باغ کے تالابوں میں سُرخ۔ زرد۔ نیلگوں، الغرض مختلف رنگ کے نیلوفر پھیلا دیئے گئے تھے۔ ۱۲

تفصیل کے لئے دیکھئے
(مقریزی صـ۳۱۶ ج ۱)

سے جو پھل گر جاتے ہیں۔ دستور وہاں کا یہ ہے کہ مالکِ باغ اس کے لینے سے کسی کو روک نہیں سکتا نتیجہ اس کا کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ :۔

ربما کثرت الرایح فیصیر الی الضعفاء والمساکین التمر فی التقاطھم اکثر مما یصیر الی اربابہ (ابن حوقل ص۲۲۴)

بسا اوقات آندھی جب کسی موسم میں زیادہ چلتی ہے تو غریبوں اور مسکینوں کے گھر اس سے زیادہ کھجوریں پہنچ جاتی ہیں جتنی ان کے مالکوں کو بھی نہیں ملتیں۔

ارزانی اشیاء کی کثرت وبہتات۔ یہ تو خیر اُس زمانہ کے لحاظ سے شاید قابلِ ذکر بھی نہیں ہے۔ لوگوں نے کثرت سے اس کے چرچے پھیلا بھی دیئے ہیں۔ ابن حوقل ہی نے لکھا ہے کہ آذربائیجان کے علاقہ میں ایک درہم میں پچاس روٹیاں اور نصف من گوشت بھی ایک ہی درہم میں۔ بلکہ :۔

والعسل والسمن والمن والجوز والزبیب وجمیع الماکول رخیص کالمجان۔ (ص۲۳۸)

شہد، گھی، سن، اخروٹ، کشمش الغرض کھانے پینے کی ساری چیزیں اتنی ارزاں ہیں کہ گویا مفت مل جاتی ہیں۔

اسی نے لکھا ہے کہ تفلیس میں تو ارزانی کا یہ حال ہے کہ بیس بیس رطل شہد خالص وہاں ایک ایک درہم تک میں ملجاتا ہے۔" (ص۲۴۲)

واقعہ یہ ہے کہ کم از کم کھانے پینے کی چیزوں کی ارزانی کا حال مسلمانوں کے عہد میں تقریباً ان کے اکثر ممالک میں جو رہا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔

لیکن باوجود اس کے تعجب اس پر ہے کہ ان ہی بیان کرنے والوں کی زبانی روپئے یعنی درہم ودینار کی کثرت کے قصے بھی جو ہم سنتے ہیں وہ کچھ کم حیرت انگیز

نہیں ہے۔

میرا اشارہ اُس دولت اور ثروت کی طرف نہیں ہے جو حکومت کے خزانے میں جمع ہوتی تھی۔ بلکہ عوام تجارت وصنعت وزراعت وغیرہ کے ذریعہ سے جو کماتے تھے۔ اس کا اندازہ ابن حوقل ہی کی ان گواہیوں سے ہو سکتا ہے ایک طرف وہ مغربی افریقہ کے آخری حدود یعنی اودغشت جو سجلماسہ سے کبھی دو مہینے کے فاصلہ پر ہے اسی کے متعلق ابن حوقل کا بیان ہے کہ:۔

رأیت صکّاً کتب بدین علی محمد بن ابی سعدون باودغشت و شھد علیہ العدول باثنین و اربعین الف دینار
(ابن حوقل ص۴۲)

میں نے ایک چک اودغشت میں دیکھا محمد بن ابی سعدون کے قرض کے متعلق تھا جس پر عادل گواہوں کی گواہیاں ثبت تھیں رقم جو چک میں مندرج تھی اسکی تعداد (۴۲) ہزار اشرفیاں تھیں۔

یہ ایک معمولی قرضہ کا چک ہے۔ بیالیس ہزار دینار (اشرفی) اب اسکو چاندی کے سکے پر حساب کر کے دیکھئے۔ وہی مان لیا جائے جیسا کہ اندلس وغیرہ میں تھا یعنی سترہ درم کا ایک دینار ہوتا تھا جب بھی یہ کیا معمولی رقم ہے۔ جن کا خیال ہے کہ سود کے بغیر قرض کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ ان کو دیکھنا چاہیئے کہ اتنی بڑی بڑی رقمیں بھی بغیر سود کے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دے دیا کرتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آخرت کا یقین اگر قلوب میں ایسی استواری حاصل کرے کہ اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی چیزوں اور اُن چیزوں میں جنہیں صرف پیغمبر کی آنکھوں کی راہ سے آدمی دیکھ رہا ہے، دونوں میں فرق باقی نہ رہے

تو پھر یہ کہنا ہی غلط ہے کہ سود کے بغیر قرض دینے والا بغیر سود کی توقع کے قرض دے رہا ہے۔ بلکہ بغیر سودی والے قرض پر جس سود کی توقع دلائی گئی ہے وہ سود والے قرض کے منافع سے یقیناً زیادہ محفوظ اور زیادہ قطعی ہے۔ بات صرف طے کرنے کی محض اس قدر ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ پہنچایا ہے خدا ہی کی طرف سے پہنچایا ہے۔

بہرحال یہ تو خیر ایک ضمنی سی بات تھی۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اشیاء کی ارزانیوں کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ روپیہ بھی اتنا سستا اُس زمانہ میں کیسے تھا۔ مغرب کا حال وہ ہے اور مشرق کا یہ ہے۔ ابن حوقل ہی کا بیان ہے، سیراف جو ایران کا قدیم تجارتی بندرگاہ تھا۔ اس کے تذکرہ میں اُسنے وہاں کے ایک سوداگر کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

اوصی ثلث مالہ الحاضر عندہ الف الف دینار (ابن حوقل ص۱۹۸)	اپنے اس مال کے ثلث کی اس نے وصیت کی جو اس کے پاس موجود تھا اور یہ ثلث مال دس لاکھ اشرفیوں کی شکل میں تھا یعنی ایک ملین اشرفی۔

جس کی ثروت کا ایک تہائی ایک ملین پونڈ تھا اسی سے حساب کر لیجئے کہ اصل ثروت کی مقدار کتنی ہوگی؟

اور یہ ایک تہائی تو صرف اُس ثروت کی تھی جو اُس کے پاس وصیت کے وقت موجود تھی۔ باقی اس کے سوا جیسا کہ ابن حوقل ہی نے اس کے بعد لکھا ہے کہ:۔

"اور مضاربت[1] پر اس نے جو دے رکھا تھا وہ الگ سرمایہ
تھا۔ جو اس رقم کے سوا ہے۔"

ایک اور دلچسپ لطیفہ اسی کتاب میں عدن کے ایک تاجر کا ہے اس کا نام "رامشت" بتایا گیا ہے اسکے لڑکے موسیٰ سے ملاقات ہوئی تھی۔ تو لکھا ہے کہ:۔

"نقرئی آلات جو موسیٰ کے زیر استعمال تھے ایک دفعہ تولے
گئے تو ایک ہزار دوسو من وزن اُن کا بیٹھا۔"

حالانکہ رامشت کا موسیٰ سب سے چھوٹا لڑکا تھا اور یقیناً اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں اسکی حیثیت گری ہوئی تھی۔ اسی رامشت کا ایک منشی جس کا نام علی بیلی بتایا ہے اُسی کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ:۔

"آج سے بیس سال پہلے چین سے مال بیچ کر ہم جب لوٹے تو
جو کچھ مجھکو ملا تھا وہ پانچ لاکھ دینار کی لوبھی تھی۔" (ابن حوقل ص ۱۹۸)

---

[1] سرمایہ ایک کا ہو اور محنت دوسرے کی ہو، تجارت کے اس طریقہ کا نام "مضاربت" ہے۔ ضروری نہیں کہ سرمایہ ایک ہی آدمی سے لیا جائے یا محنت کرنے والا بھی ایک ہی ہو۔ بلکہ دونوں طرف شرکت کا طریقہ اختیار کر کے بھی اس معاملہ کو کیا جاسکتا ہے جو اُس زمانہ میں کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے موجودہ کمپنیوں کی صورت گویا پیدا ہو گئی تھی۔ سرمایہ داروں کے پس ماندہ سرمایہ کے استعمال کی یہ ایک ایسی راہ تھی کہ جس میں سرمایہ دار نفع کے ساتھ نقصانات میں بھی محنت کرنیوالوں کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ اسی لئے سود خواری کی وجہ سے جو نتائج آج پیدا ہو گئے ہیں وہ اسلامی عہد میں نہیں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۲

اس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ خود اصل مالک رامشت کی دولت کتنی ہو گی اور یہ کوئی دو تاجروں کی استثنائی حالت تھی؟

ابن حوقل نے سیراف کے عام تاجروں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

ان الرجل من التجار لینفق علی دارہ زیادۃ علی ثلاثین الف دینار۔ (ابن حوقل ص۱۹۸)

عموماً یہاں کے تجار اپنے مکانوں پر جتنی رقم صرف کرتے ہیں۔ اُن کی تعداد تیس ہزار اشرفیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔

افسوس ہے کہ حکومت اور حکومت سے تعلق رکھنے والوں کی دولت و ثروت کا تو کتابوں میں عموماً تذکرہ کیا جاتا ہے لیکن عہد اسلامی میں حکومت والوں کے سوا عام آبادی کا مالی لحاظ سے کیا حال تھا؟ لوگوں نے اس کی طرف کم توجہ کی ہے۔ اسی لئے عموماً ایک احساس اس قسم کا پایا جاتا ہے بلکہ بعضوں کو لوکہتے ہوئے بھی دیکھا ہے کہ عہد اسلامی کی ارزانیوں کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت روپیہ کی صورت دیکھنے کے لئے عوام ترستے تھے۔ گذشتہ چند معمولی مثالیں صرف ابن حوقل کی کتاب سے میں نے پیش کی ہیں تفصیل اس وقت میرے سامنے بھی نہیں ہے۔ یہ ایک مستقل بحث کا موضوع ہے۔ ہندوستان تک کی تاریخوں میں لوگوں کو ملے گا کہ ایک ایک تاجر لاکھوں بلکہ کروڑوں کا بندوبست کر سکتا تھا۔

مشہور واقعہ ہے کہ عورت کے ملا عبد الغفور جو عالمگیری عہد کے تاجر ہیں اُن کا سرمایہ کروڑوں سے متجاوز تھا (دیکھو مآثر الامرا ص۳۴۸ ج۱)

عالمگیر کا لڑکا مراد بخش جو گجرات کا گورنر تھا۔ اُس کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ حاجی پیر محمد زاہد حلی سے ایک دفعہ چھ لاکھ قرض شاہزادے نے لیا۔ اس قسم کے جزئیات اگر جمع کئے جائیں تو ان سے عوام کی ثروت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آج ہندوستان میں مسلمان جو آباد ہیں اگر یہ صحیح ہے کہ غوری نے امام رازی سے روپیہ قرض لے کر ہندوستان پر چڑھائی کا سامان کیا تھا۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک عامی مسلمان ہی کی دولت کی طفیل میں ہندوستان فتح ہوا۔ کیونکہ امام رازی کے پاس جیسا کہ سبھوں نے بالاتفاق لکھا ہے۔ اسے شہر کے ایک طبیب کی دولت اس راہ سے پہنچی تھی کہ طبیب جو اولادِ نرینہ سے محروم تھا اُس نے امام صاحب کے لڑکوں سے اپنی لڑکیوں کی شادی کر دی تھی۔ اور جو کچھ کیا یا تھا وہ اپنے دامادوں کے حوالے کر دیا تھا۔ غوری نے امام صاحب سے یہی روپیہ ہندوستان پر غالباً آخری دفعہ چڑھائی کے وقت قرض لیا تھا۔ جس میں اسے کامیابی نصیب ہوئی۔

اس کا پتہ تو نہ چلا کہ یہ کتنا روپیہ تھا۔ لیکن ایک فوجی مہم اور وہ بھی آخری فیصلہ کن مہم کیلئے قرض کیا دس بیس روپیہ لیا جا سکتا ہے؟

کامل ابن اثیر میں بصرے کے ایک تاجر جس کا نام شریف عمر تھا اسکے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کی سالانہ آمدنی تجارت سے دو کروڑ پچاس لاکھ درہم تھی (ص ۳، ج ۹)

القفزی نے ایک طحان (چکی پینے والا) کے متعلق لکھا ہے کہ پہلے بصرہ میں

رہتا تھا معتصم باللہ کے زمانہ میں بغداد چلا آیا تھا۔ یہاں کاروبار میں اس کے اتنا فروغ ہوا کہ ایک سو دینار (اشرفی) روزانہ زکوٰۃ کی مد میں خیرات کیا کرتا تھا۔ (ص۱۳۴)

عباسی خلفاء کے عہد میں جوہریوں کی ایک طویل فہرست کتابوں میں ملتی ہے۔ ان ہی جوہریوں میں الجصاص جوہری بھی تھا۔ مقتدر باللہ ایک دفعہ اس سے خفا ہو گیا اور حکم دیا کہ اس کی دولت کا جائزہ لیا جائے۔ لکھا ہے کہ صرف اشرفیاں ایک کروڑ آٹھ لاکھ برآمد ہوئیں۔ ماسوا اس کے دوسری قسم کی جائدادیں مثلاً مکانات۔ گاؤں۔ گھر کا ساز و سامان یہ چیزیں نقد دولت سے الگ تھیں۔ اور عباسیوں یا امویوں کے دور کو جانے دیجئے خود عہد نبوت اور خلافت راشدہ میں عوام میں دولت مندوں کی کیا کمی تھی۔ مشہور صحابی حضرت طلحہؓ جو اپنی خیر و خیرات کی وجہ سے "الفیاضؓ" کے لقب سے مشہور تھے لیکن باوجود ان فیاضیوں کے وفات کے بعد جو دولت چھوڑی تھی اسکا اندازہ اسی سے کیجئے کہ خزانچی کے پاس بارہ لاکھ درہم نقد موجود تھے جائداد جو چھوڑی تھی اسکی قیمت تین کروڑ لگائی گئی۔ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وفات کے بعد تین بھار سونا حضرت طلحہؓ کے خزانے سے برآمد ہوا۔ بھار گائے کی کھال کو کہتے ہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی ثروت کا قصہ مشہور ہے۔ وفات کے بعد سونے کے ڈلے جب ان کی بیویوں میں تقسیم ہونے لگے تو کاٹنے والوں کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے۔ چار بیویوں میں ہر ہر بیوی کو اسی اسی ہزار اشرفیاں ملیں۔

حضرت زبیر بن العوام کی دولت کا اندازہ موجودہ حسابی اصطلاح میں ۳۵ ہزار ملین کیا گیا ہے۔ اور عموماً ان لوگوں کے پاس یہ سرمایہ کاروبار یعنی تجارت وزراعت ہی سے اٹھا ہوا تھا۔ حضرت طلحہؓ سے تو صراحتہً منقول ہے کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے سب تجارت اور بیوپار سے حاصل ہوا ہے۔ کاشت بھی مختلف مقامات میں کرتے تھے۔ صرف مدینہ منورہ کے کھیتوں اور باغوں کی سیرابی کے لئے بیس اونٹ کام کرتے تھے۔ مدینہ میں گیہوں کی کاشت کی ابتدا آپ ہی نے کی۔ عہدِ صحابہ کی تجارت وزراعت اور دوسرے معاشی کاروبار کا قصہ طویل ہے۔

صحابہ کے بعد بھی ایک مدت تک مسلمانوں کے اندر تجارتی اولوالعزمیوں کے جس جذبہ کو ہم پاتے ہیں۔ جس پیمانہ پر اسلامی عہد کے ان شاداب دنوں میں تجارتی کاروبار ہو رہا تھا۔ اسکے لحاظ سے عوام کی مذکورہ دولت وثروت میں شک کرنے کی کوئی وجہ بھی معلوم نہیں ہوتی۔ ابنِ حوقل نے یہ بیان کرتے ہوئے کہ اردبیل سے مراغہ جانے والوں کو کن کن منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ ایک منزل کا نام کورسرہ بتایا ہے۔ لکھا ہے کہ وہاں ایک قصرِ عظیم بڑے قلعے کے اندر ہے۔ پھر یہ کہتے ہوئے کہ اس کور (ضلع) میں کتنی رساتیق (سب ڈویژن) ہیں۔ لکھا ہے کہ اس علاقے میں سالانہ چند میلے چاند کی ابتدائی تاریخوں میں لگتے ہیں۔ آگے یہ بیان کر کے کہ:۔

وقد ادرکتھا قدیما ودخلتھا وانا حدث (ابن حوقل ص۲۵۲)

بہت زمانہ ہوا ان میلوں میں بھی شرکت ہوا ہوں۔ جب نوعمر تھا۔

اس میلہ کی تشریح جن الفاظ میں اس نے کی ہے ان کا ترجمہ یہ ہے :-

"ان میلوں میں طرح طرح کے لوگ جو مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں شریک ہوتے ہیں۔ جن کے ساتھ مختلف قسم کے تجارتی سازوسامان ہوتے ہیں۔ مثلاً کپڑے۔ عطر۔ سرکہ۔ روشنی کے سامانوں کو بیچنے والے۔ ٹھٹھیرے۔ سونا۔ چاندی۔ گھوڑے خچر۔ گدھے۔ گائے۔ بیل۔ بھیڑ۔ بکریاں وغیرہ۔

پھر اس کے بعد لکھتا ہے کہ :-

"جس زمین اور جس علاقے میں یہ میلہ لگتا ہے اور اُسکی نشیبی زمینوں۔ اُس کے ٹیلوں۔ اُسکے پہاڑوں پر جو مخلوق اکٹھی ہوتی ہے اُس کو دیکھکر حج کے موسم کا موقف یاد آجاتا ہے بلکہ جو جو چیزیں اس میلے میں جمع ہوتی ہیں اور جتنے علاقے کو وہ گھیرتی ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے تو کہا جاسکتا ہے کہ عرفات کے میلے سے بھی یہ میلہ بڑا ہوتا ہے۔ حالانکہ خود عرفات کا میدان جس میں حج کے موسم میں یمن۔ مصر۔ عراق۔ مغرب اقصیٰ شام۔ خراسان۔ اور جو جو علاقے ان مقامات سے ملے ہوئے ہیں وہاں کے لوگ تین فرسخ (یعنی نو میل کے طول و عرض میں) پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔

پھر کوہ سرخ کے اس میلے میں جس پیمانہ پر کاروبار ہوتا ہے بطور مثال کے اس نے ذکر کیا ہے کہ صرف ایک تاجر ابواسحاق ماجروانی کے متعلق مجھے معلوم

ہوا کہ دو لاکھ جانور تو اسکے اس میلے میں ایک سال بکے تھے۔ ابنِ حوقل کا بیان ہے کہ میں نے ابو محمد عبدالرحمٰن ابن السری سے پوچھا کہ کیا یہ واقعہ ہے؟ تو انہوں نے اس کی توثیق کی اور کہا کہ اس بیچارے کا انتقال ہو گیا۔ پھر بیان کیا کہ اسی میلے میں اس نے کبھی دس دس لاکھ بھیڑ بکریاں فروخت کی ہیں۔ میں نے کہا کہ دس لاکھ۔؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں دس لاکھ! بلکہ اضافہ کیا کہ دوسرا تاجر جس کا نام شعیب بن مہران تھا اس نے بھی اسی قدر جانور فروخت کئے تھے۔ آخر میں خود ابنِ حوقل نے لکھا ہے کہ:۔

"اس میلے کے متعلق اور بھی واقعات بعد کو مجھے معلوم ہوتے رہے لیکن ان چیزوں کی تفصیل میری اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔ واقعہ کے اندازے کیلئے صرف اتنی بات بھی کافی ہے۔" (ابن حوقل ص ۱۵۳)

اور یہ تو ایک نمونہ مشرقی ممالک کی تجارت کا تھا۔ یہی ابنِ حوقل مغرب کا چشم دید حال ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ یعنی مصر سے نکل کر آدمی جب صحرائے لیبیا کی طرف روانہ ہوتا ہے تو یہ لکھ کر کہ سب سے پہلے جو بڑا شہر اس کے سامنے آتا ہے وہ برقہ ہے اور برقہ سے قیروان کو راستہ جاتا ہے۔ بہر حال مغربی افریقہ کی اس پہلی منزل کی کیفیت یہ تھی:۔

"اس شہر برقہ میں بکثرت تمہیں تاجر اور دوسرے ممالک کے لوگ ہر وقت اور ہر زمانہ میں نظر آئیں گے۔ ان لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ کسی وقت بھی منقطع نہیں ہوتا۔ اور یہ سب کے سب

بیوپار کی غرض سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ قافلوں پر قافلے تمہیں اس حال میں ملیں گے کہ ان میں کوئی مشرق سے مغرب کی طرف جا رہا ہے۔ کوئی مغرب سے مشرق کی طرف آرہا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ مغربی مقام ہے جہاں اوحلہ سے چرم اور کھجور وغیرہ کھنچ کر آتے ہیں۔ اس شہر میں متعدد بازار اور میلے ہیں جو ہر وقت گرم رہتے ہیں۔ اُن میں اُدن۔ سیاہ مرچ۔ شہد موم روغنِ زیتون۔ اور طرح طرح کی چیزیں مشرقی اور مغربی ممالک سے آتی جاتی رہتی ہیں۔" (ابن حوقل صـ۲۷۸)

اور اگر ابنِ حوقل کا یہ کوئی گھڑا ہوا لطیفہ نہیں بلکہ واقعہ ہے تو عہدِ اسلامی کے تجارتی ولولوں اور اس راہ کے بلند حوصلوں کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سیراف جس کے متعلق گذر چکا کہ ایران کی قدیم بندرگاہ ہے۔ اسی شہر کی تجارت اور اسکے تاجروں کا حال بیان کرتے ہوئے اُنے بجنسہ لکھا ہے کہ:۔ اس کے الفاظ ہی نقل کئے دیتا ہوں کہ:۔

ولقد بلغنی ان رجلاً	مجھے معلوم ہوا ہے کہ سیراف کے ایک
من سیراف الف البحر	آدمی (تاجر) کو سمندر سے اتنا انس
حتیٰ انه لم یخرج من	ہو گیا تھا کہ جہاز سے چالیس سال تک
السفینة نحوا ربعین	اس نے باہر قدم ہی نہیں رکھا۔ جب
سنة وکان اذا قارب البر	خشکی (یعنی کسی سمندر کے ساحل پر)
اخرج صاحبه فقضی	پہنچتا تھا اور اپنے کسی ساتھی کو وہاں

حوائجه في كل مدينة	بھیج دیا کرتا تھا جو تمام ضروریات کی
يتحول من سفينة الى اخرى	تکمیل ہر شہر میں کر دیتا تھا اور کوئی جہاز
اذا انكسرت واحتيج لها	اگر ٹوٹ جاتا یا مرمت کے قابل ہو جاتا تو
اصلاحها	دوسرے جہاز پر منتقل ہو جاتا لیکن
(ص۱۲)	خشکی پر اترتا نہیں تھا

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اس نے لکھا ہے کہ۔۔

"ان ہی تجارتی اولوالعزمیوں کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ بڑے دولتمند ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مسافرت کی زندگی کو خوب برداشت کرتے ہیں یہی راز ہے اس بات کا کہ جہاں کہیں یہ ہوں وہاں بڑی فراغبالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

پھر سیراف کے ایک لکھ پتی کا ذکر کیا ہے جس کا نام ابو بکر احمد بن عمر السیرافی تھا بڑا طویل قصہ اس کا نقل کیا ہے کہ وہ بصرہ میں تھا اس کے کسی دوست کا خط لے کر ابن حوقل اس سے بصرہ میں کسی ضرورت سے ملا خط لے کر اس نے پڑھا بھی نہیں صرف زبانی پوچھنے لگا کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے اور قبل اس کے کہ ابن حوقل اپنی بات پوری کرے اقبل على غلمانه وذكر مراكبه وحاله (اپنے نوکروں کی طرف متوجہ ہو کر جہازوں کا حال دریافت کرنا شروع کیا)

ابن حوقل نے لکھا ہے کہ اس کا یہ متکبرانہ طرز عمل مجھے سخت ناگوار گزرا اور اسی وقت میں اٹھ کر باہر نکل آیا۔ اس کا بیان ہے کہ غصہ کے مارے مجھے

یہ بھی سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور میرے سامنے کیا ہے اس کے بعد طویل قصہ ہے کہ تاجر نے مجھے جب نہیں پایا تو نوکروں سے پوچھا لوگوں نے کہا کہ وہ تو غصہ میں چلا گیا۔ آدمی دوڑا کر مجھے واپس بلایا وغیرہ وغیرہ دراصل عام طور پر تاجروں خصوصاً سیراف کے تاجروں کے متعلق اس کے قلم سے یہ جملہ جو نکل گیا ہے کہ:

اما تجارھم فالغالب علیھم	سیراف کے تاجروں
محبۃ الجمع للمال والحرص	پر بہ نسبت دوسروں
فوق من سواھم من اھل	کے مال کی محبت زیادہ
الامصار (ابن حوقل ص۲۰۶)	غالب ہے۔

دراصل اس کی وجہ احمد بن عمر تاجر کی شاید یہی بے اعتنائی ہے ورنہ سچ یہ ہے کہ آج جب مسلمان اپنی حکومت اور حکومت کی آمدنی کھو چکے ہیں خصوصاً ہند میں جتنے بھی اسلامی اور دینی کام انجام پا رہے ہیں عموماً ان ہی مسلمان تاجروں کی سخاوت و سیر چشمی کے رہین منت ہیں میں تو ان اسلامی تاجروں کو اسی بنا پر "عزۃ الاسلام والمسلمین" کے لقب سے ملقب کرتا ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ آج ہی نہیں مسلمانوں کے عام لوگوں کا خوش حال طبقہ جن میں زیادہ تر تاجروں ہی کی جماعت تھی۔ ان کا یہی حال تھا۔

خود ابن حوقل نے مختلف ممالک کے حالات جو بیان کئے ہیں بطور مثال کے ان نمونوں کو بھی دیکھ لیجئے۔ اسی راستہ کے تذکرے میں جو مصر

سے قیروان کو جاتا تھا۔ برقہ کی منزل کے بعد اس نے اس مرحوم طرابلس المغرب کا ذکر کیا ہے جس سے ان حالیہ کشتوں کی ابتدا مسلمانوں پر شروع ہوئی تھی جن سے بیسویں صدی عیسوی میں مسلسل ہم گذر رہے ہیں۔ یہ لکھ کر کہ:۔

"سفید پتھروں سے بنا ہوا یہ شہر ساحل سمندر کے کنارے بڑا شہر ہے۔ بازار بھی اسکے وسیع ہیں۔ برقہ سے اسکی بلندی کچھ کم ہے یہاں محض خاص قسم کے لذیذ فواکہ بھی ملتے ہیں۔ مثلاً امرود اور فرسک (ایک قسم کے نرم چھلکے کا شفتالو) اگرچہ کم ہوتے ہیں لیکن لذت و شیرینی میں ان کی نظیر کم دیکھنے میں آئی ہے۔"

یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"یہاں کے بازار میں قیمتی اونی اور بہترین لباس جو نفوسیہ کہلاتے ہیں اور نیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سیاہ جبے جنکی کافی قیمت ہوتی ہے اور اسی قسم کی چیزیں اُن جہازوں سے اترتی ہیں جو یہاں شب و روز لنگر انداز ہوتے ہیں اور صبح و شام تجارت کا یہی قصّہ یہاں جاری رہتا ہے۔ روم اور مغربی افریقہ سے مال یہاں آتا ہے جو مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔"

پھر طرابلس کے باشندوں کی کچھ خصوصیات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہ:۔ "ان لوگوں میں جو انکے گرد و نواح میں رہتے ہیں شہر طرابلس کے باشندے عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں خصوصاً ان کا

رہن سہن۔ لباس حسنِ صورت اور شریفانہ متمدن زندگی خاص امتیاز رکھتی ہے:

مسلمانوں کی مہمان نوازی اور تعمیری مذاق کی خصوصیات

آخر میں مسافروں اور پردیسی تاجروں کے ساتھ مروّت کا جو سلوک ان لوگوں کی طرف سے ہوتا تھا اس کو بیان کرتے ہوئے ابنِ حوقل لکھتا ہے کہ:۔

"ان لوگوں کا برتاؤ دوسروں کے ساتھ بڑا اچھا ہے۔ دل انکے نرم اور محبت سے بھرے ہوئے ہیں نیتیں ان کی پاک و صاف ستھری ہیں۔ سمجھ درست اور سلجھی ہوئی ہے۔ جسمانی صحت بھی ان کی قابلِ رشک ہے۔ لوگوں سے جو معاملہ کرتے ہیں اسمیں ان کی ہمیشہ تعریف ہی کی جاتی ہے۔ حکومت کے ساتھ بھی ان کا تعلق امن پسندانہ ہے۔ مسافروں اور پردیسیوں کے ساتھ تو ان کا برتاؤ اتنا اچھا ہے کہ مشکل ہی سے کسی دوسرے شہر کے لوگ اس باب میں اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں سرائیں بھی اُن کے شہر اور علاقہ میں بکثرت ہیں"

پھر مسافرنوازی کے سلسلے میں اُن کے طریقۂ خاص کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے کہ۔

"جب انکی بندرگاہ پر جہاز پہنچتے ہیں تو اس علاقہ میں تیز و تند ہوائیں چونکہ چلتی رہتی ہیں اس لئے سمندر میں بڑا تلاطم رہتا ہے

جہاز کہاں پر لنگر انداز ہوں۔ اسکے فیصلہ میں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔ لیکن شہر والوں کا قاعدہ ہے کہ جوں ہی کسی جہاز پر نظر پڑتی ہے فوراً اپنی اپنی کشتیوں اور جہازوں کو لنگر دینے کے لیے جن رسّوں کی ضرورت ہوتی ہے لے کر پہنچ جاتے ہیں اور یہ معاملہ کسی معاوضہ کی توقع پر نہیں کرتے بلکہ رضاکارانہ طور پر ایک رواج ہے جو اس علاقے میں جاری ہو گیا ہے اور فوراً ہی رسّوں کو پھینک کر چند لمحوں میں بڑی پھرتی سے جہاز کو لنگر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ کام کچھ اس طرح انجام دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کوئی زحمت ہی نہیں اٹھانی پڑتی اور لطف یہ ہے کہ ایک حبہ اس کام کا معاوضہ جہاز والوں سے نہیں چاہتے۔ صرف پردیسیوں کی خدمت اور انکے لیے آسانی بہم پہنچانے کا شوق ہے جو ان سے اس کام کو انجام دلاتا ہے"۔

(ابن حوقل ص۷۴)

یہ مغرب کے مسلمانوں کی زندگی کا ایک نمونہ تھا۔ اب مشرق کا نقشہ بھی ابن حوقل ہی کی زبان سے ملاحظہ کیجئے۔

وہ ایران کے ان باشندوں کا جو اسکے زمانہ میں وہاں آباد تھے ان الفاظ میں تذکرہ کرنے کے بعد کہ:-

ان لوگوں میں بعض اچھی قدیم روایات اور عمدہ عادتیں پائی جاتی ہیں۔ | وبقايا رسوم سنة جميلة وعادة فيها بيتهم (ابن حوقل ص۲۰۲)

پھر اس کی تفصیل کرتے ہوئے اسی مشرقی حصۂ ملک کے ایک رئیس جن سے ابن حوقل
نے بھی ملاقات کی تھی اُن کا نام جعفر بن سہل بتاتا ہے اور وہ حارث بن فریغون
کے کاتب (سکریٹری) تھے۔ صرف اُس ایک شخص کے متعلق وہ لکھتا ہے
کہ:۔ [1]

"پچاس سال کی مدت میں ایسا کوئی آدمی شاید ہی ہوگا جو خراسان
پہنچا ہو اور اس امیر کے بذل و نوال سے مستفید نہ ہوا ہو۔
یا کوئی نہ کوئی احسان کسی نہ کسی طریقہ سے اس پر اس امیر کی طرف
سے نہ ہوا ہو۔ خواہ اس کی ملاقات بھی اس امیر سے نہ ہوئی ہو
بلکہ خط یا عرضی ہی کے ذریعہ سے اس کی رسائی اس کے دربار تک ہوئی ہو۔"

---

[1] اس موقعہ پر بے ساختہ مغلی تمدن کی اُس آخری یادگار کا تذکرہ خیال آ جاتا ہے میرا اشارہ
حکومتِ آصفیہ کے سابق مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی سے ہے کہنے والے
سچ کہتے تھے کہ خواہ وہ مسلمان رہے یا نہ ہوں لیکن اسلامی تمدن جو ہندوستان میں قائم ہوا
تھا اس کی وہ یقیناً آخری یادگار تھا۔ بیس پچیس سال تک خود اس فقیر نے دیکھا کہ
ٹھیک ان کا حال بھی حیدرآباد میں یہی تھا۔ بڑا مشکل تھا کہ حیدرآباد میں باہر سے
کوئی آدمی آ جائے اور مہاراجہ تک کسی طرح اس کی رسائی ہوئی ہو اور وہ خالی ہاتھ واپس
کیا گیا ہو۔ مگر وہ آخری آدمی تھا اب وہی حیدرآباد ہے اور وہی آصفیہ حکومت ہے آمدنی
کے لحاظ سے کچھ شبہ نہیں اب اس کی حالت بہ نسبت سابق کے بہتر ہے لیکن جس تمدن نے اپنا
ہندوستان میں اپنا خیمہ گاڑا تھا حیدرآباد اس کے سائے سے کیسے بچ سکتا تھا۔ حالانکہ سننے میں آتا ہے کہ
آج سے چالیس پچاس سال پہلے حیدرآباد میں ایک مہاراجہ ہی نہیں تھے بلکہ امراء کی یہ فیاضیاں،
مسافر نوازیاں عام تھیں۔ لیکن جہاں ان کا تمدن مدفون ہوا وہیں وہ بھی مدفون ہو گئیں ۱۲

اور آخر میں اس خیر مجسم کے متعلق لکھتا ہے کہ :۔

"بلکہ اس شخص نے تو بعض ایسی مخفی تدبیریں اختیار کر رکھی ہیں جنکے ذریعے سے ان لوگوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچ جاتا ہے جنہوں نے اس شخص تک پہونچنے اور رسائی حاصل کرنے کی کوشش بھی نہ کی ہو۔ اور اپنی حاجت کسی طریقہ سے بھی اس پر ظاہر نہ کی ہو"۔

اور وہ تدبیر جو اس امیر نے مسافروں کے متعلق اختیار کر رکھی تھی اسکی تفصیل ان الفاظ میں کرتا ہے کہ :۔

"اس شخص نے ان تمام مواضع و مقامات میں جو اسکی جاگیر میں ہیں سرائیں تعمیر کرادی ہیں اور ان سراؤں پر ان ہی مواضع اور مقامات کی آمدنی کا ایک حصّہ وقف کر رکھا ہے۔

اس قسم کے تمام مقامات میں اس امیر کی طرف سے گائیں پلی ہوئی ہیں۔ قوّام (یعنی جو اسکے ان مقامات میں پنجرا در چیزوں کی دیکھ بھال کیلئے اسکی طرف سے نگران اور داروغہ ہیں) ان گایوں کے دودھ کو نکلواتے ہیں اور راہ گیروں اور آنے جانے والوں کی تواضع اسی خالص دودھ سے کرتے ہیں۔ صرف دودھ ہی نہیں بلکہ اسکے ساتھ دوسرے کھانے اور اطعمہ بھی ہوتے ہیں۔ جو ان مسافروں کی ضرورت کیلئے کافی ہوتے ہیں۔ اسی طرح گرمیوں کے دنوں میں اس امیر کی ان تمام سراؤں میں رائب (دہی یا لسّی) کا نظم بنایا ہے۔ حکم ہے کہ انتہائی اخلاق اور مہربانی کے ساتھ ہر اس شخص

کو یہ ..... پلا یا جائے جو اس کی جا گیر کے ان علاقوں سے گذرتے ہیں"۔

ابن حوقل نے یہ بتلاتے ہوئے کہ ہر سرائے میں اس امیر کی طرف سے جو گائیں رہتی ہیں انکی تعداد کیا ہوتی ہے، میں تو پڑھکر حیران ہو گیا کہ بادشاہ نہیں وزیر نہیں۔ ایک معمولی حکومت کا عہدہ دار یعنی سکریٹری، اور فیاضی کا حال یہ ہے۔ سنئے ابن حوقل راوی ہے کہ:۔

ومامن قرية ورباط له الا وفيه المائة بقرة الى فوق ذالك لهذا الوجه والمقصد دون بقرة العاملة له في اسباب مناخعة۔ (ابن حوقل ص۲۰۹)	اس شخص کا کوئی گاؤں اور اسکی کوئی سرائے ایسی نہیں ہے جس میں سنو اور سنو سے اوپر گائیں محض اسی مقصد (یعنی مسافروں کیلئے) نہ رہتی ہوں۔ یہ گائیں اُن بیلوں کے علاوہ ہیں جو خود امیر کے ذاتی کاروبار کو انجام دینے کے لئے وہاں رکھے جاتے ہیں۔

اس سے آپ کو اُس زمانے کے مسلمانوں کے اس ذوق کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے جو مویشیوں کی پرورش اور نگہداشت کے متعلق رکھتے تھے۔ خیال تو کیجئے ہر ہر قریہ اور ہر ہر رباط میں علاوہ عام کاروباری ضرورتوں کے سو اور سو سے اوپر

لہ جانوروں، پرندوں اور اسی قسم کی چیزوں کے پالنے کا ایک عام ذوق اسلامی امراء میں پایا جاتا تھا۔ پھر کوئی کتاب لکھنا چاہے تو لکھ سکتا ہے لیکن ایک ہندوستانی امیر نے جو باغ حیوانات اپنے یہاں قائم کیا تھا۔ میں تو نہیں سمجھتا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

گا لیں کا رکھنا اور اس طور سے رکھنا کہ مسافروں کو ان کے دودھ سے ہر وقت تمتع و استفادہ کا موقع ملتا رہے۔ کیا معمولی نگہداشت اور توجہ کا محتاج ہے؟ ماوراء النہر کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی ابن حوقل نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ:۔

"کھانے پینے، لباس وغیرہ کے لحاظ سے یہ لوگ جس فراخی اور فراغ بالی کی حالت میں ہیں اس کا ذکر تو میں کر چکا۔ یہی حال انکے پانی کا ہے۔ حد سے زیادہ شیریں ٹھنڈا اور ہلکا پانی ہر جگہ ماوراء النہر میں بآسانی میسر ہے۔ جو اس ملک کے پہاڑوں اور مرغزاروں میں

(باقی پچھلا) کہ موجودہ زمانہ کے باغِ حیوانات میں بھی وہ چیزیں اس وقت تک جمع کی گئی ہوں بلکہ جمع کرنے کا خیال بھی کسی کو مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔ صاحب مآثر الامراء نے فضل اللہ خاں جو شاہجہانی اور عالمگیری عہد کے امراء میں ہیں ان کے متعلق یہ لکھ کر کہ "بجز مؤتلف (انسان) چوپاؤں درندوں وحشی جانوروں پرندوں اور حشرات الارض کے اور کسی کی صحبت مشکل ہی سے یہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لئے دنیا کے شہروں اور مختلف ہندوستان سے لوگ اس قسم کی چیزیں پیدا کر کے لاتے رہتے ہیں" آخر میں روایت نقل کی ہے۔ "گویند کہ جانورے بود از وحشی دالسی و متعارف دیگر متعارف کہ در سرکارش فراہم نیامدہ" انتہا انکے ذوق کی یہ بھی کہ کیک پشہ وسوس و شپش را در اوانی چوبی و مسی کہ کاہ داشتہ و پرورش داده لیتی (چھچھڑ کھٹمل کیڑے جو غلہ میں پڑتے ہیں اور جوئیں تک جیسی چیزوں کو لکڑی اور تانبے کے بنے ہوئے ظروف یعنی ڈبیہ وغیرہ میں ان کو محفوظ کئے ہوئے تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے۔ (مآثر الامراء ص۳۲ ج۳) سانپ بچھو تک تو عجائب خانے میں دیکھے گئے ہیں لیکن جھینگوں کیڑوں جوؤں وغیرہ جیسی چیزوں کو بھی زندہ عجائب خانہ میں شریک کرنا یہ اسی مسلمان رئیس کی اُپج تھی ۱۲

دولت مند رہتا ہے۔ اور اس پر لطف یہ ہے کہ یا سانی جمد (منجمد) قدرتی برف بھی اُن کے قابو میں ہے۔ ہر جگہ یہ برف یہاں ملتی ہے"۔

اس تذکرہ کے بعد لکھتا ہے کہ:۔

"ان کی مواشیاں اور جو بچے اُن سے حاصل ہوتے ہیں وہ ان کی تمام ضرورتوں کے لئے کافی ہیں۔ کیونکہ ان مواشیوں کے ساتھ ان کا گہرا تعلق ہے۔ اور یہی حال گھوڑوں، اونٹوں اور گدھوں کا ہے"۔

اس نے لکھا ہے کہ:۔

"ان کی بھیڑ بکریاں بھی اتنا دودھ دیتی ہیں جو ان کی ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بکریاں عموماً غزیہ اور خرلجیہ ہوتی ہیں ان پاس زیادہ بچے جننے والی بکریاں اور دوسرے مواشی بکثرت ہیں"

(ابن حوقل صفحہ ۱۳۶)

ان غزیہ اور خرلجیہ بکریوں کا حال ان ہی لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ:۔

ولا تضع الشاة بالنزل اقل	ترکوں (یعنی جو غزا ور خرلجی کہلاتے
من اربعة واذا كثرت	تھے اُن ہی ترکوں) کی یہ بکریاں چار سے
خمسة او ستة شبه الكلبة	کم بچے تو دیتی ہی نہیں۔ زیادہ پانچ اور
فاما لا ثنتان	چھ تک تعداد ان کے بچوں کی پہنچ جاتی ہے
والثلاثة	گویا ان کا حال کُتیا کا سا ہے (یعنی

فلا تحسنم الا فی المفرد (الہمدانی و ابن حوقل ص۲۹)

وہ بھی اسی قدر زیادہ بچے دیتی ہے) باقی دو یا تین بچے، کبھی کبھی انفرادی طور پر ایسا بھی ہوتا ہے (لیکن عام حال یہی ہے)۔

اور سچ تو یہ ہے کہ ابن حوقل کا یہ بیان ما وراء النہر اور اس کے فواکہ کے متعلق اگر صحیح ہے یعنی اُسنے اس علاقے کے میووں اور فواکہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"باقی ان کے فواکہ تو تم سغد دریا کی وادی اور اشروسنہ فرغانہ، شاش کے علاقوں میں سفر کرتے ہوئے اگر گھسو گے تو تم کو خود معلوم ہو جائے گا کہ اتنے پھل دُنیا میں شاید ہی کہیں ہوتے ہوں۔ کثرت ہی کا نتیجہ ہے کہ عموماً ان پھلوں کو اُن کے جانور اور اُن کے مویشی کھاتے ہیں۔" (ابن حوقل ص۳۳۷)

خیال کرنے کی بات ہے کہ بکریوں اور بھیڑوں، گایوں کو جہاں سیب ناسپاتی۔ شفتالو۔ اور خدا جانے کیا کیا پھل جسکی تفصیل بھی مختلف مواقع پر ان لوگوں نے کی ہے یہ چیزیں کھلائی جاتی ہوں وہاں کے آدمیوں سے تو کیا جانوروں سے بھی ان ملکوں کے آدمی برابری نہیں کر سکتے جن کی قسمت میں ان پھلوں کے صرف نام ہی ہیں۔

بہر حال گفتگو تو اسمیں ہو رہی تھی جو ان ممالک کے لوگ پردیسیوں اور مسافروں کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے۔ ایران کے بعد ایک اور نمونہ ما وراء النہر کا بھی دیکھتے چلیے۔ ابن حوقل نے یہ لکھکر کہ باقی اس علاقہ کے رہنے والوں کا

سیرچشمیاں، مسافر نوازیاں۔ سو اس کا حال یہ ہے۔ ابن حوقل کے الفاظ میں سلئے۔ لکھتا ہے :۔

فان الناس فی اکثر ما وراء النهر	ماوراء النہر کے اکثر علاقوں کا حال یہ ہے
کانهم فی دار واحدة	کہ وہاں کے لوگ گویا ایک ہی گھر کے رہنے
ما ینزل احد باحد الا کانه	والے معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کے گھر
دخل فی دار نفسه لا یجد	جب مہمان ہو کر آتا ہے تو اسے ایسا محسوس
المضیف من طارق	ہوتا ہے کہ خود اپنے ہی گھر میں اترا ہے
بطرقه کراهیة بل یستفرغ	میزبان مسافروں کے آنے سے بجائے کسی
جهده فی اقامة اوده	گرانی کے عموماً مسافروں کی ضرورتوں
من غیر معرفة تقدمت	کی تکمیل میں کوشش کرتے ہیں خواہ
ولا توقع لمکافاته	پہلے سے شناسائی نہ بھی ہو اور نہ کسی
(ص ۳۳۸)	معاوضہ کی توقع سے ایسا کرتے ہیں۔

اسی سلسلے میں اور بہت سی دوسری چیزوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک نمونہ کا ذکر ابن حوقل نے ان الفاظ میں کیا ہے :۔

"میں نے سغد کے علاقے میں خود ایک مکان کو دیکھا اب تو وہ بند پڑا ہوا ہے لیکن مجھے صحیح ذریعے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ تقریباً سو سال تک اس ڈیوڑھی کا پھاٹک کبھی بند نہیں ہوا اور اس طویل عرصے میں کسی مسافر کو اترنے سے یہاں منع نہیں کیا گیا۔"

اور آخر میں یہ نقل کرتا ہے کہ :۔

وبسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ اچانک بغیر کسی سابقہ اطلاع کے سو سو، دو دو سو آدمی بلکہ اس سے بھی زیادہ اپنے اپنے جانوروں اور سواریوں، ساز و سامان اور نوکر چاکر کے ساتھ رات کو پہنچے ہیں۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ ان کے جانوروں کو بھی کافی گھاس چارہ، دانہ پہنچا دیا گیا اور خود ان کے کھانے پینے اوڑھنے بچھانے کا انتظام اس طور پر کر دیا گیا تھا کہ خود اپنے سامان کو کھولنے کی ضرورت ان مسافروں کو نہیں پڑی۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ سارا سامان اتنی آسانی سے ہو گیا کہ خود صاحب مکان کو کوئی غیر معمولی دشواری اٹھانی نہیں پڑی جس کی وجہ یہی ہے کہ مہمان نوازی کے تمام ساز و سامان یہاں کے باشندے عموماً تیار رکھتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان مسافروں کی مختلف ضروریات کیلئے مختلف خدام جو ان ہی کے نام مختص ہوتے ہیں تیار رہتے ہیں۔ صاحب مکان کو کسی جدید حکم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ملازمین کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کیا کیا کام کرنا چاہیئے"

میزبان کا کام فقط اس قدر رہتا ہے کہ اپنے مہمانوں سے کشادہ پیشانی ملتا جلتا رہے۔ اور ان مہمانوں میں سے کسی کو یہ نہ محسوس ہونے دے کہ میزبان نے کسی کے ساتھ کوئی خاص ترجیحی برتاؤ کیا ہے"

سوچنے کی بات ہے۔ سو سو، دو دو سو مہمانوں کو اُتارنے، اُن کے سونے بیٹھنے رہنے سہنے کیلئے کتنے بڑے بڑے مکانوں کی ضرورت ہوگی۔ اس سے سلاطین کی تعمیری اولوالعزمیوں کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔

میرا مقصد اسلامی تعمیرات کے ان قصّوں سے نہیں ہے جو سلطنتوں کی طرف سے بنائی گئی ہیں۔ وہ تو ایک الگ بجائے خود مستقل داستان ہے۔ لکھنے والے اس پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ قصر زہرا، قصر حمراء، ابن طولون کی مصری عمارتیں یا دارالسّلام بغداد، سرّمن رای اور دوسری اسلامی تختگاہوں میں ان کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے تعمیرات کا سلسلہ کمّاً و کیفاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانہ میں اس حد کو پہنچ چکا تھا۔ جیسا کہ ازالۃ الخفا میں حضرت شاہ ولی اللہ نے نقل فرمایا ہے کہ:۔

در زمان خلافت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہزار و سی و شش شہر با توابع آن مفتوح شد و چہار ہزار مسجد ساختہ گشت و نہ صد منبر بجہت محاریب جوامع بجہت خطبہ جمعہ بنا کردند۔ (صفحہ ۱۵ / ج ۲)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں ایک ہزار چھتیس شہران کے ملحقہ علاقہ کے ساتھ فتح ہوئے۔ اُن کے زمانہ میں چار ہزار مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ اور نو سو منبر محرابوں کے بازو میں جمعہ کے خطبہ کیلئے بنائے گئے۔[1]

---

[1] جس کا مطلب یہی ہوا کہ ہر مسجد میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں منبر نہیں قائم کیا گیا تھا۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ خوب فرماتے ہیں کہ نماز جمعہ اور نماز ظہر میں فرق ہے یعنی ظہر کی نماز تو ہر جگہ اور ہر شخص پر فرض ہے لیکن جمعہ کی حیثیت یہ نہیں ہے اسکے لئے خاص قسم کی آبادی

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ تو کمیت اور مقدار کا حال ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل چودہ پندرہ سال کے بعد مسجدوں کا یہ نظام سارے مفتوحہ علاقے میں قائم کردیا گیا تھا۔ باقی کیفیت سو اس کا اندازہ آپ کو مؤرخین کی اس قسم کی عبارتوں سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً کوفہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم سے جو مسجد بنی تھی معجم البلدان میں اس کے متعلق

(باقی پچھلا) کی ضرورت ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کتنا کھلا ہوا مسئلہ ہے۔ تمام صحابہ کے سامنے یہ واقع ہوا اور کسی سے منقول نہیں ہے کہ اس نے یہ مطالبہ کیا ہو کہ جہاں جہاں مسجدیں بنائی گئی ہیں وہاں منبر بھی قائم کئے جائیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ اسی زمانہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع قائم ہو چکا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مشہور اثر لاجمعۃ ولا تشریق الا فی مصر جامع کے متعلق جن لوگوں نے یہ توجیہ پیش کی ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام کے عہد میں خوارج چونکہ مسجدوں میں حضرت کے خلاف سازشی کمیٹیاں کرتے تھے، اس لئے آپ مسجدوں میں آپنے عام اجتماع کی ممانعت کردی تھی گویا یہ حکم سیاسی مصالح پر مبنی تھا۔ یہ کتنی غلط توجیہ ہے کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پہلے ہی اس نظام کو قائم کردیا گیا تھا۔ ابن حوقل اور البلاذری وغیرہ عموماً شہروں اور آبادیوں کا حال لکھتے ہوئے یہ بھی تصریح کرتے جاتے ہیں کہ یہاں منبر ہے یا نہیں، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے زمانے تک جمعہ کی نماز ہر آبادی میں نہیں ہوتی تھی بلکہ عموماً مرکزی مقامات کی مسجدوں میں منبر ہوتا تھا ٹھیک جیسے حالیہ تمدن میں آبادیوں کے فرق کو بتاتے ہوئے آجکل یہ لکھا جا سکتا ہے کہ یہاں سینما اور تھیٹر نہیں ہے اس سے معلوم ہوگا کہ وہ کوئی معمولی گاؤں اور جہاں بتایا جاتا ہے کہ یہاں سینما حال ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ کوئی معقول آبادی ہے اسی طرح عہد اسلامی میں آبادیوں کے اس فرق مراتب کو منبر ہے یا نہیں اس سے ظاہر کیا جاتا تھا۔ ۱۲

لکھا ہوا ہے۔ میں بجنسہ نقل کرتا ہوں ؛۔

وکتب عمر بن الخطاب	حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (کوفہ)
الی سعد ان اختط موضع	والی) سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ
المسجد الجامع علی عدۃ	عنہ کو لکھ بھیجا کہ جامع مسجد کی داغ بیل
مقاتلتکم فخط علی اربعین	ان سپاہیوں کی تعداد کے مطابق ڈالو جو
الف انسان فلما قدم زیاد	کوفہ کی چھاؤنی میں سکونت پذیر ہیں اس
زاد فیہ عشرین الف	فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت سعد
انسان وجاء بالاجر	بن ابی وقاص نے مسجد کی بنیاد رکھی جس
وجاء باساطینۃ	میں چالیس ہزار آدمیوں کی گنجائش تھی
من الاھواز۔	پھر کوفہ کا والی جب زیاد ہوا تو بڑھا کر
(معجم البلدان ص۲۹۷)	بیس ہزار آدمیوں کی گنجائش کا اور اضافہ کر دیا اس
جلد ۷	کیلئے اینٹیں منگوائی گئیں اور ستون اسکا اہواز سے آئے۔

ایک ایک مسجد جس میں چالیس چالیس ہزار انسانوں کی گنجائش پیدا کی جائے اور چالیس ہزار سے بھی آگے بڑھ کر زیاد کی گورنری کے زمانہ میں ساٹھ ہزار انسانوں تک کی گنجائش اس میں پیدا کی گئی ہو! ذرا اس مسجد کے طول و عرض کا اندازہ تو کیجئے۔ خرچ اس پر کیا ہوا تھا۔ عہد فاروقی کی کفایت شعاری کے باوجود لکھا ہے کہ:۔

وقد انفقت علی کل اسطوانۃ سبع	ہر ستون پر سترہ سترہ سو خرچ ہوئے
عشر مائۃ (ایضاً ص۲۹۹)	تھے۔

بہ ظاہر مراد درہم ہی معلوم ہوتا ہے لیکن ایک ایک ستون پر اتنا خرچ جب آیا تھا تو کل ستونوں پر کتنا خرچ بیٹھا ہوگا۔؟

بہرحال میری غرض اس وقت مسلمانوں کی اُن عمارتوں اور بنیادوں سے نہیں ہے جنکی تعمیر میں حکومت کا ہاتھ تھا۔ خواہ خود سلاطین نے اُن کی تعمیر کرائی ہو یا حکومت کے حکام و ولاۃ کے وہ کارنامے ہوں۔ کیونکہ علاوہ سلاطین کے یہ واقعہ ہے کہ اسلامی حکومتوں کے ان حکام و ولاۃ کی اولوالعزمیوں بھی اس راہ میں کچھ کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ خیال تو کیجئے۔ اسلام کا ابتدائی زمانہ ہے۔ پہلی صدی ہجری ہے۔ اور کسی بہت بڑے آدمی نے نہیں۔ حجاج کے طبیب الدیلمی نے فارس کی ایک نہر جس کا نام نہر طاب تھا۔ ابن حوقل نے لکھا ہے کہ رجان نامی قریہ کے دروازہ سے نکلنے کے بعد جو راستہ خوزستان کی طرف جاتا ہے۔ اسی پر یہ دریا طاب نامی واقع ہے اس پر اسی الدیلمی نے ایک پل بنوا دیا تھا جسکی خصوصیت یہ تھی کہ:۔

وھی طاق واحد سعۃ مابین	یہ پل صرف ایک کمان (محراب) ہے
عمودیہ علی وجہ الارض ثمانون	دونوں دیواریں جو اس کمان کی زمین
خطوۃ وارتفاعہ مقدار مایجوز	پر ہیں اُن کا درمیانی فاصلہ اسّی قدم ہے
فیہ راکب بجمل بیدہ علم من	اور بلندی اس کمان کی اتنی ہے کہ اونٹ
اکبر مایکون من الاعلام	پر بیٹھکر اونچے سے اونچا جھنڈا لیکر آدمی
(ابن حوقل ص۲۱۲)	اسکے نیچے سے گذر سکتا ہے۔

اور یہ تو خیر عرب سے باہر کا حال ہے پہلی صدی ہجری میں خود مدینہ منورہ کا حال

تعمیری لحاظ سے کس معیار تک پہنچ چکا تھا۔ عام لوگوں کی عمارتوں کی کیفیت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ سیرین جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام تھے اور بعد کو بطریقہ کتابت انہوں نے آزادی حاصل کر لی تھی۔ عموماً تجارتی کاروبار کرتے تھے۔ طبقاتِ ابنِ سعد میں ہے کہ ان کے پڑپوتے بکار بن محمد بیان کرتے تھے:

رأیت مجلس سیرین الذی بناہ بجذوع بعت انا منہا اربعین جذعاً کل جذع بدینار
(طبقات ابن سعد ص ۸۸ ج ۷)

میں نے سیرین کی بنائی ہوئی نشستگاہ دیکھی تھی شہتیروں سے بنائی گئی تھی (یہ شہتیریں کیسی تھیں اس کا اندازہ اس سے کرو کہ) خود میں نے اس کی ایک ایک شہتیر ایک ایک اشرفی میں فروخت کی تھی۔

اور جب ایک پردیسی غلام کی عمارت کا یہ رنگ ہے۔ اسی سے عام شرفائے مدینہ کی عمارتوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

تاریخوں میں حضرت طلحہؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت سعدؓ۔ حضرت زید بن ثابتؓ وغیرہ کی حویلیوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ الہمدانی نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ میں ساگوان اور صنوبر کی لکڑیاں بصرہ کی بندرگاہ سے درآمد ہوتی تھیں اور بطن نخل کوئی جگہ تھی۔ جہاں خاص طور پر معلوم ہوتا ہے کہ چونہ بنانے کی بھٹیاں بنائی گئی تھیں۔ وہیں سے مدینہ چونہ جاتا تھا۔ (الہمدانی ص ۱۰۹)

صحابہ ہی میں آخر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں اور کیسے صحابی؟ لیکن عموماً کتابوں میں ملتا ہے کہ آپ نے کوفہ میں۔ بصرہ میں۔ اسکندریہ

میں۔ فسطاط (مصر) میں الگ الگ قصور بنوائے تھے۔

خیر یہ قصہ تو بہت طویل ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بڑے بڑے مکانات اور کتنے بڑے بڑے کہ بوقتِ واحد جیسا کہ گزر چکا ایسے مکانات مسلمانوں کے عموماً ہوتے تھے۔ جن میں سو سو۔ دو دو سو مہمان بآسانی اُتارے جا سکتے تھے اور اُن کے آرام و آسائش کا وہاں نظم کیا جا سکتا تھا۔ پس یہی دیکھنے کی بات ہے کہ تعمیری وسعتوں کے اس شوق کے پیچھے مسلمانوں کے اندر اس زمانہ میں محرکات کیا ہوتے تھے۔ الہمدانی نے اگرچہ ایک موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں عام خیال یہ بھی تھا کہ۔

سعۃ الدار تزید فی العقل کما — گھر کی کشادگی سے عقل میں اضافہ ہوتا ہے
ان ضیقہا ینقص عقلہ (ص۱۵۲) — اور مکان کی تنگی سے عقل گھٹتی ہے

اور اس زمانہ میں یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اونچے اور بڑے مکانوں میں رہنے والوں کے خیالات میں بھی تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بلندی اور وسعت پائی گئی ہے اور تنگ و تاریک مکانوں میں رہنے کے جو عادی ہوتے ہیں عموماً دیکھا گیا ہے کہ ان کی ہمتیں پست اور حوصلے تنگ ہوتے ہیں۔

لیکن اسی کے بعد خود الہمدانی نے بھی لکھا ہے کہ ایک خیال اس زمانے میں یہ بھی تھا کہ۔

لہ کئی سال ہوئے معارف میں ایک صاحب جو غالباً یورپین ہی تھے ان کے ایک مضمون کا ترجمہ یا خلاصہ تھا جس میں اسی نظریہ پر بہت زور دیا گیا تھا اور لکھنے والے کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ اس زمانہ کا یہ کوئی خاص نظریہ ہے۔ ۱۲

"گھر ہی گھر والے کی دنیا ہوتی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہیئے کہ اپنے دیوان خانے (یعنی زنانے کے سوا جو مردانہ حصّہ ہوتا ہے اس کو ذرا خوبصورت بنائے اور نفاست و لطافت کا اُسکی تعمیر میں خاص طور پر خیال کرے۔ کیونکہ وہی حصّہ تو مکان کا چہرہ ہوتا ہے اور مہمانوں کے ٹھہرنے کی جگہ بھی وہی ہوتی ہے۔ دوستوں کے ملنے جلنے کا مقام بھی وہی ہوتا ہے۔ اور نوکروں چاکروں کے آرام لینے کی جگہ بھی وہی ہوتی ہے۔ پھر بچوں کے پڑھانے کے لئے معلّم کو بھی اسی میں جگہ دینی پڑتی ہے اور اجازت لیکر جس حد تک بیرونی لوگ آسکتے ہیں۔ وہ بھی مکان کا یہی حصّہ ہوتا ہے"

(الہمدانی ص۱۵۴)

جس سے آپکو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ بڑے بڑے مکانوں کے بنانے سے مسلمانوں کے سامنے اس زمانہ میں کیا کیا اغراض ہوتے تھے اور مکان کے بیرونی حصّہ سے کیا کیا کام لیا جاتا تھا۔ گویا مہمانخانہ۔ ملاقات کا کمرہ۔ بچوں کا مکتب خانہ۔ نوکروں اور شاگرد پیشہ والوں کے رہنے کی جگہ۔ الغرض ان ساری چیزوں کی گنجائش کا خیال کر کے عموماً مکان بنوائے جاتے تھے۔ اور یہ تو الہمدانی نے لکھا ہے، باقی ابن حوقل نے ماوراء النہر کے مسلمانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو لکھا ہے کہ:-

"یہاں کے لوگوں میں سب سے بڑا شوق اور سب سے بڑا حوصلہ جس چیز کا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں ہر شخص اپنی اپنی وسعت و گنجائش کے

مطابق یہ چاہتا ہے کہ مہمانوں کے لئے اپنے گھر کو جس حد تک ممکن ہو سجا کر سلیقہ کے ساتھ رکھا جائے۔"

پھر یہ لکھنے کے بعد بیان کرتا ہے کہ :-

"ان کے اس جذبہ کا اندازہ کرنے کے لئے شاید یہ مشاہدہ کافی ہو سکتا ہے کہ ان میں کوئی آدمی جو کوئی گاؤں یا جائداد رکھتا ہے اس پر بس یہی دھن سوار رہتی ہے کہ کوئی بڑا کشادہ کھلا ہوا قصر (مکان) مہمانوں کے لئے تعمیر کرے۔ عام طور پر ان لوگوں کو تم پاؤ گے کہ آنے والے مسافروں کے خیال سے وہ اپنے گھر کے ساز و سامان کے درست کرنے اور اس کے سجانے، مرتب کرنے کے مشغلے میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی حال میں اگر کوئی مہمان آ گیا تو یہ واقعہ ہے کہ باہم ایک دوسرے سے اس معاملہ میں الجھ جاتے ہیں۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ اس کو اپنا مہمان بنالے۔ ماوراء النہر میں کسی شخص کو میں نے نہیں دیکھا جس پر یہ جذبہ مہمان نوازی کا مسلط نہ ہو۔ اس قصے میں وہ اپنے روپئے، پیسے، مال و متاع کو اس بے دردی سے خرچ کرتے ہیں اور اس خرچ میں اسی طرح مقابلہ کرتے ہیں۔ جیسے دوسرے علاقے کے لوگ مال جمع کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔" (ابن حوقل ص۳۳۸)

اس سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ زیادہ تر مکانی وسعتوں کے شوق کا محرک مسلمانوں میں کون سا جذبہ تھا، گو آخری الفاظ ابن حوقل کے ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے

کہ شاید چوتھی صدی ہجری میں مہمان نوازی کا یہ جذبہ صرف ما وراء النہر ہی کے مسلمانوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود اسی شخص نے اپنی اسی کتاب میں جہاں کہیں کے مسلمانوں میں پہونچنے کا ذکر کیا ہے۔ عموماً ان کی مہمان نوازیوں کی اس نے تعریف ہی کی ہے۔ حتیٰ کہ سجلماسہ (مغربی افریقہ) کے مسلمانوں کا ذکر ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ:-

"یہاں کے باشندے خوش حال، خوش جمال ہیں۔ ان کی آبادیوں کی چاروں طرف گھنے باغات اور نخلستان پائے جاتے ہیں۔ ان میں بڑی مروّت اور سیرچشمی میں نے دیکھی۔ ان کے مکانات عموماً کوفہ کے مکانات جیسے ہیں یعنی بڑے اونچے اونچے دروازے اور بھاری بھر کم محلات۔"

آخر میں خود سجلماسہ اور سجلماسہ سے سوس۔ اغمات۔ فاس۔ تاہرت کے قریب خوارا ورتنس[1]۔ مسیلہ۔ طبنہ۔ باغایہ سے اکریال۔ اذقون۔ اور بونہ تک کے علاقوں میں جہاں کہیں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں لکھتا ہے،

یضیفون المارّۃ ویطعمون الطعام۔ (ص۶۶)

مسافروں کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ انہیں کھانا کھلاتے ہیں۔

بلکہ اس علاقے کے بعض بربری قبائل کے مسلمانوں کے متعلق اسی مہمان نوازی کے سلسلے میں بعض ایسی باتیں نقل کی ہیں کہ دل انکی تصدیق پر آمادہ نہیں ہوتا یعنی

---

[1] یہ تیونس نہیں ہے بلکہ دوسری جگہ کا نام ہے۔ تیونس سے یہ سارے مقامات مہینوں کے فاصلہ پر ہیں۔ مغربی افریقہ کے معمورے کے گویا یہ آخری حدود ہیں۔ ۱۲-

بہر حال مجھے تو صرف یہ دکھانا تھا کہ اکرام ضیف کا یہ قصہ کچھ ماوراء النہر کے مسلمانوں ہی کی خصوصیت نہ تھی بلکہ مشرق سے مغرب کے آخری کناروں تک مسلمان جہاں کہیں بھی آباد تھے اسکو ایک قسم کا اسلامی شعار سمجھتے تھے۔ خود ابن حوقل نے تفلیس (طفلس جو روس کے ڈکٹیٹر اسٹالن کا مولد ہے) وہیں کا ایک طویل قصہ اسی مہمان نوازی کے متعلق نقل کیا ہے۔ یہ لکھکر کہ:۔

"اس شہر (تفلیس) کے لوگ بھی پردیسیوں اور مسافروں کے ساتھ خاص اُنس رکھتے ہیں۔ یہ عموماً سُنّی ہیں۔ قدیم روش کے پابند ہیں۔ علم حدیث سے اُن کا خاص تعلق ہے! اسی لئے محدثین کا خصوصاً اور جن میں علم و ادب کی خوشبو پائی جاتی ہو۔ ان کا عموماً احترام کرتے ہیں۔" (ابن حوقل ص۲۴۲)

آگے تقریباً ایک صفحہ میں اس داستان کو اس نے ادا کیا ہے۔ آخری فقرے اسکے کچھ مبہم اور نامفہوم سے ہیں، غالباً طباعت کی غلطی کا نتیجہ ہے یا اور کوئی بات ہو، بہر حال اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی وجہ سے ابن حوقل نے یہ قسم کھالی تھی کہ میں یہاں کسی کا مہمان بن کر نہیں رہوں گا۔ یہ حال جب شہر کے بعض معززین کو معلوم ہوا تو وہ لکھتا ہے:۔

فعقدلی مجلس للمناظرة علی هذا الیمین فی دار امیرهم وحضر القاضی فابتدأنی دونهم (ایضاً)	میری اس قسم کے متعلق لوگوں نے ایک خاص مجلس اپنے امیر کے گھر پر منعقد کی اس مجلس میں شہر کے قاضی بھی تھے۔ گفتگو کی ابتداء قاضی ہی نے کی۔

پھر قاضی کی پوری تقریر نقل کی ہے جس کا آخری فقرہ یہ ہے کہ:۔

فانا منذ ادرکنا شیوخنا ثم	ہم نے اپنے بڑے بوڑھوں کو جب سے
تفاوضہم واصطلاحہم علی انہ	دیکھا ہے اور اُن کے رسم و رواج کو
کا یجوزان یبیت غریب ببلدنا	ہم جانتے ہیں۔ وہ یہی ہے کہ ہمارے شہر
فی منزلہ ولا خادمین لہ	میں یہ نہیں ہو سکتا کہ مسافر اور مسافر
(ص ۲۲۳)	کے نوکر جا کر اپنے گھر میں اُتریں۔

آخر میں قاضی نے ابن حوقل کو صاف صاف کہہ دیا کہ:۔

"جو صورت ہم پیش کر رہے ہیں۔ اگر تم اس پر راضی نہیں ہو تو پھر تمہارا ہمارے یہاں سے کوچ ہی کر جانا بہتر ہے۔ تاکہ تم کو دیکھ دیکھ کر ہم لوگوں کو جو تکلیف ہوتی رہے گی اس سے تو ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ باقی قسم کا عذر جو تم پیش کرتے تو مسلمانوں کے یہاں قسم کا کفارہ بھی تو دیا جا سکتا ہے۔ ہم تمہاری طرف سے کفارہ ادا کریں گے۔"

کچھ بھی ہو جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے اکرام ضیف کی عادت مسلمانوں کی عام عادت مجھے معلوم ہوتی ہے۔ خود ہندوستان کا حال اُس وقت تک جب تک اسلامی تعلیم کا اثر یہاں کے مسلمانوں میں باقی تھا۔ مہمان نوازی میں جہاں تک میں جانتا ہوں یہی حال تھا[1]

---

[1] مجھے اپنے بچپن کے زمانہ کی یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ گیلانی جو فقیر کا آبائی وطن ہے۔ بہار کا حالانکہ ایک مختصر سا گاؤں ہے۔ بمشکل بیس پچیس شریف مسلمانوں کے مکان وہاں ہیں ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے اور مسافر خانہ بھی اُس کے ساتھ ہر جس میں لوگ

(باقی آگے)

خیر ذکر تو عام مسلمانوں کے مکانوں اور تعمیری خصوصیتوں کا ہو رہا تھا کیونکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میری بحث کا تعلق صرف عوام ہی کے مکانات سے ہے۔ خلفاء و سلاطین یا ان کے وزراء۔ امراء اور ان کی تعمیری اولوالعزمیوں کے محرکات اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان کا

(باقی پچھلا)

واحد آٹھ دس آدمی رات گذار سکتے ہیں لیکن اس گاؤں میں بھی عموماً یہ دیکھا کرتا تھا کہ کسی وقت بھی مسافروں کی خواہ کتنی بڑی تعداد ہی کیوں نہ آ نکلے آئی ہو۔ بستی والے بیچارے مسلمان جو معمولی خوش باش زندگی رکھنے والے تھے۔ ان کے کھلانے پلانے سونے پڑنے کا نظم ضرور کر دیتے تھے۔ بعض بعض موقعوں پر میں نے دیکھا ہے کہ دس گیارہ بجے آٹھ آٹھ نو نو مسافروں کا مجمع مسجد کے مسافر خانہ میں آ کر ٹھہر گیا ہے۔ دیہات کے لوگ سویرے کھا پی کر سو رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لوگ سوئے ہوئے ہیں لیکن جوں ہی خبر ملی کہ مسافر آ گئے ہیں جس سے جو کچھ بن پڑتا انکے سامنے لا کر حاضر کرتا اس کو اپنی بستی کی بڑی ہتک سمجھتے تھے کہ مسافر بھوکا سو گیا۔ لیکن بتدریج جیسے جیسے تمدن کے آثار سے جب ملک متاثر ہونے لگا تو تیس چالیس سال کے اندر اندر اب یہ انقلاب ہو گیا ہے کہ مسافر آتے ہیں۔ مؤذن گھروں میں جا کر اطلاع دیتا ہے لیکن عموماً اسکو اب یہی جواب ملتا ہے کہ کھلانے کا نظم ہمارے یہاں نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ مالی حیثیت سے پچھلوں کی حالت پہلوں سے بہتر ہے۔ چند قدامت پرست گھر ہیں جو اب تک اس پرانی لکیر کو پیٹے جاتے ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ یہی حال اب عموماً لوگوں پر اپنا اثر قائم کر رہا ہے قصور اسمیں ہندوستان والوں کا نہیں ہے بلکہ اس تمدن کا ہے جسکی سب سے بڑی خصوصیت

(باقی اگلے صفحہ پر)

مقابلہ بھلا بے چارے عوام خوش باش لوگ کیا کر سکتے تھے۔ جہاں صرف معماروں کی سبزی اور ترکاری پر ہزار ہا ہزار روپیے صرف ہوتے ہوں'

(باقی حاشیہ) یہ ہے کہ جس طرح اپنی مادہ کے سوا جانوروں کو اپنے ماں باپ سے بھی تعلق باقی نہیں رہتا۔ بچوں سے بھی رابطہ اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک رزق طلبی کی قوت انہیں خود پیدا نہیں ہو جاتی۔ اسکے بعد وہ اپنے بچوں سے بھی اسی طرح بیگانہ ہو جاتے ہیں جیسے ان سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ جن کے وہ بچے ہوتے ہیں۔ جب انسانوں کی تربیت اسی حیوانی تمدن کے اصول کے تحت ہو رہی ہے تو اب مسافر نوازی اور مہمان پروری کے قصے، پارینہ قصے نہ بن جائیں گے تو اور کیا ہو گا۔ کیا چیلوں اور کوؤں کے گھر کبھی آپ نے مہمانوں کو اترتے دیکھا ہے؟ بلکہ بعض حیوانوں میں تو وطنی جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ اُنکا ہم جنس ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر کہیں بھولا بھٹکا انکے گاؤں کی طرف وہ پردیسی بے چارہ نکل آتا ہے تو دانت نکالے بھونکتے ہوئے اس کی طرف دوڑتے ہیں۔ افسوس اسلام نے اس ملک کو ایک بڑی شریفانہ عادت سے روشناس کیا تھا۔ لیکن اسلام کا دبدبہ ہی جب قلوب سے اٹھ گیا تو اسکے نتائج کا انتظار کیوں کیجئے۔ اس سلسلے میں ایک مفید بات کا خیال آگیا۔ گجرات کے مسلمانوں میں ایک خاص بات جس کا مسافر نوازی سے تعلق ہے بڑی اچھی ہے۔ شہر، قصبہ، گاؤں، سب ہی میں یہ دستور عام ہے کہ کسی خوش حال آدمی کا انتقال جب ہو جاتا ہے تو اسکی طرف سے توشک، لحاف، تکیہ وغیرہ بنوا کر لوگ مسجد میں بھیجتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ گاؤں گاؤں کی مسجدوں میں مسافروں کیلئے اوڑھنے بچھانے کا اتنا کافی سامان موجود رہتا ہے کہ مسافر سردی کے سخت ترین موسم میں بھی کیوں نہ وہاں پہنچ جائے کسی قسم کی تکلیف اسکو نہیں ہوتی۔ ایک اچھی سنت ہے۔ دوسرے علاقے کے مسلمان جو کبھی اکرام ضیف کو اپنے پیغمبر کا حکم یقین کرتے ہیں۔ وہ بھی اس طریقے کو اگر اختیار کریں تو اچھا ہے۔ ۱۲

جیسا کہ "جامع اموی" دمشق کے تذکرے میں الہمدانی نے لکھا ہے کہ:۔

وثمن البقل الذی اکله صناع الجامع الاموی فی مدة ایامہ العمل ستة الاف دینار (الہمدانی ص۱۰۶)

جامع اموی کے بنانے والوں کا صرف ترکاری پر جو کچھ خرچ ہوا تھا اُس کی مقدار چھ ہزار اشرفی تھی۔

پھر جس جس قسم کے قیمتی پتھر اور سونے، چاندی کو پانی بنا کر ان عمارتوں میں لوگ صرف کرتے تھے، اُن کا تو ایک عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔[۱] لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اسلامی سلاطین کو آپ جو کچھ چاہیے کہئے مگر عام مسلمانوں کا قدم عموماً بحمد اللہ اعتدال کے حدود سے زندگی کے اکثر شعبوں میں متجاوز نہیں ہوا ہے۔

---

(۱) اس جامع اموی میں کہتے ہیں کہ ایک کروڑ بارہ لاکھ دینار ولید بن عبدالملک نے خرچ کر ڈالے یہ یا اسی طرح دوسرے مسلمان سلاطین کی فضول خرچیوں کا ذکر اس زمانے کے بعض مؤرخین مزے لے کر کرتے ہیں۔ مگر سچ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات کو کتابوں میں جب میں پڑھتا ہوں تو شرم سے گردن جھک جاتی ہے، خبط کے سوا بھلا اسکو اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اچھے خاصے شہروں کا طول آٹھ دس میل ہوتا ہے لیکن مسعودی نے لکھا ہے۔ کہ معتضد نے "الثریا" نامی قصر جو بنایا تھا صرف طول اس کا تو میل تھا۔ اسی طرح مقتدر کا "دار الشجرۃ" جس کے اندر سونے چاندی کی ترکیب سے مشہور درخت بنائے گئے تھے جنکی ہر ہر شاخ میں پھول پتے جواہر اور موتیوں سے تیار کئے گئے تھے اور مختلف پرندے نقرئی و طلائی اُن شاخوں پر اس طرح بنائے گئے تھے کہ جب ہوا چلتی تھی تو یہ سارے مصنوعی پرندے چہچہانے لگتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعی زندہ پرندے ہیں۔ اسی طرح ابن طولون کے بیٹے خمارویہ نے مصر میں جو عیاشیاں کیں تو حد کر دی۔ کہ گدا ز توشک کی جگہ اس نے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایک طرف تو آپ ان طلسم ہوشربائی داستانوں کو سن رہے ہیں جو اسلامی سلاطین کے متعلق بیان کرنیوالے بیان کرتے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ ان سلاطین

(باقی پچھلا) ایک بڑا حوض بنوا کر اسمیں لاکھوں روپیہ کا پارہ بھرا تھا۔ اس پر ہوا سے بھرا ہوا چمڑے کا گدا بچھا دیا جاتا تھا۔ اسی پر لیٹ کر یہ احمق اس گدے پر اچھلتا تھا۔ اور کیا کیا بیان کیا جائے کہ ناخدا ترس حکام نے مسلمانوں کے روپے کو کیسی بری طرح ضائع اور برباد کیا۔ صرف ایک عورت زہرا نامی کی خواہش کی تکمیل کیلئے اندلسی خلیفہ نے دو کروڑ اشرفیاں خرچ کر کے قصر زہرا بنوایا اور ان حماقتوں کو میں کہاں تک شمار کراؤں خود ہندوستان میں بھی اس سلسلہ میں بے ترتیبیاں کیا کم ہوئی ہیں۔

الہمدانی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی خلافت کے زمانے میں جامع اموی کے جواہرات اور زر نقرہ کو چاہا تھا کہ نکلوا کر بیت المال میں جمع کر دیا جائے اسی فکر ہی میں تھے کہ روم سے قیصر کے سفراء کا ایک وفد دمشق آیا وفد کو لیکر حضرت مسجد کی طرف تشریف لے گئے تو دیکھا کہ مارے حسد کے سفیروں کے چہرہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے آواز بھی نہیں نکل سکتی۔ اس مشاہدے کے بعد آپ نے رائے بدل دی اور فرمایا کہ "اس مسجد کو ھذا غیظ علی الکفار (میں اے مسلمانو! دیکھتا ہوں کہ کافروں کے قلوب کا ہماری مسجد غصہ بن گئی ہے) گویا شوکت کفر پر اس سے بھی گونہ ضرب پڑ گئی تھی۔ پس اس واقعہ نے آپکو اپنے ارادے سے باز رکھا۔ ہم بھی جب سوچتے ہیں تو ان واقعات کے تذکرے سے اتنا فائدہ تو ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے قلوب میں اپنی عظمت رفتہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی یا کسی زمانہ میں اس شیر کو اپنی حقیقت پر پھر مطلع کرے جو بکریوں کیساتھ اس وقت گھاس چرنے میں مصروف ہو گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان [illegible]

(باقی آگے)

کے گردو پیش میں جو امراء رہتے تھے ان پر بھی ان کی بُری مصلحتوں کا کچھ اثر پڑا ہو۔ ابن ابی اصیبعہ نے بغداد کے ایک طبیب کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ جس کمرے میں وہ رہتا اور آرام کرتا تھا اُس کے اطراف میں اس نے بعض ذیلی مکانات ایسے بنا رکھے تھے۔ جن میں گرمیوں کے موسم میں برف کے تودے جمع کر دیئے جاتے تھے۔ اور اُس کے غلام اُس پر پنکھا کرتے رہتے تھے اسی طرح جاڑوں میں بجائے برف کے اُس میں دہکتے ہوئے انگاروں کا انبار جمع کر دیا جاتا تھا۔ اور لوہار جس طرح مشکوں سے اپنی بھٹی کو پھونکتے ہیں۔ اس کے غلام ان انگاروں کو پھونکتے تھے۔ اور یہ ساری کاروائی اس طریقے سے انجام دی جاتی تھی کہ کمرے میں بیٹھنے والوں کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔

(دیکھو عیون الانبار ص ۱۴۰ ج ۱)

لیکن اس قسم کی عیاشیاں بشرطیکہ انہیں اس زمانہ میں عیاشی قرار دی جائے۔

(باقی گھیلا) چونچلوں کی کچھ توجیہ ہو سکتی ہے تو یہی ہو سکتی ہے مسلمان سلاطین و امراء کی ان تعمیری فضول خرچیوں کے متعلق آج ہی نہیں پہلے بھی دلوں میں سوالات پیدا ہوئے ہیں المقدسی نے خود اپنا قصہ بیان کیا ہے کہ میں نے اپنے چچا حسن سے عرض کیا کہ مسلمانوں کے مال کو ولید نے دمشق کی جامع مسجد پر جو خرچ کر دیا اس سے کہیں بہتر بات یہ تھی کہ سڑکوں پلوں اور قلعوں وغیرہ کے بنانے میں اس رقم کو لگاتا۔ چچا نے یہ سنکر کہا کہ بیٹے ایسا خیال ہرگز نہ کیجیو میرے نزدیک تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولید کو توفیق عطا کی گئی تھی اور شاید اس پر یہ کھولا گیا کہ شام عیسائیوں کا ملک ہے جہاں انکے بہترین بڑے بڑے گرجے بنے ہوئے ہیں۔ جنکی آرائش و زیبائش میں بڑا زور صرف کیا گیا ہے مثلاً قمامہ کا یا لد کا گرجا مسلمان ان گرجوں کو دیکھکر ممکن تھا کہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے۔ ولید کو خدا نے توفیق دی اور ایسی چیز بنا کر چلا گیا کہ اس کا تماشا دنیا کے عجائبات میں ہو رہا ہے ۱۲

محض چند مخصوص امراء کی حد تک محدود نہیں ورنہ جہاں تک ان ہی مؤرخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گو طویل و عریض مکانوں کے بنانے کا تو مسلمانوں کو ضرور شوق تھا۔ مصر والوں کے متعلق ابن حوقل ہی نے لکھا ہے کہ:۔

"ان لوگوں کی حویلیاں اور ڈیوڑھیاں چند منزلوں کی ہوتی ہیں چھ۔ چھ۔ سات سات اور پانچ پانچ منزلوں سے کم نہیں ہوتیں۔ بسا اوقات ایک ایک گھر میں دو دو سو آدمی رہتے ہیں۔"

پھر ایک لطیفہ یہ بیان کیا ہے کہ:۔

"فسطاط (مصر کا قدیم پایۂ تخت) میں دار عبد العزیز کے نام سے ایک مکان مشہور ہے۔ اس مکان کے رہنے والوں کیلئے روزانہ چار سو پکھالوں کے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔" (ابن حوقل ص۹۶)

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ معمولی قصبوں اور دیہاتوں ہی میں نہیں۔ بڑے بڑے عظیم الشان شہروں میں مسلمان مکان عموماً مٹی کا بنایا کرتے تھے اور بہت زیادہ تکلّف سے کام لیا گیا تو آجر (پکی اینٹ) اور جصّ (گچھ) استعمال کرتے تھے۔ یہ اُن کے تکلف کی انتہا معلوم ہوتی ہے۔

ابن حوقل نے آذربائیجان کے عنوان کے نیچے لکھا ہے کہ اس علاقہ کا سب سے بڑا شہر اس وقت میں اردبیل ہے اسی میں معسکر (چھاؤنی) بھی ہے اور دار الامارۃ بھی اسی کا بیان ہے کہ ثلاثین فرسخ (یعنی نوّے میل تک) اس ضلع کے حدود ہیں لیکن بناتا ہے:۔

والغالب علی بنائھا الطین والاٰجر (ابن حوقل ص۲۳۷) زیادہ تر مکانات اس علاقے کے مٹی اور اینٹوں کے ہیں۔

پھر "الدیلم" کے تحت لکھتا ہے کہ سب سے بڑا شہر اس علاقے کا "رے" ہے مگر

ھی مدینۃ بناءھا من طین — اس شہر کی عمارتیں بھی مٹی ہی کی بنی ہوئی

ویستعمل فیھا الاجر والجص — ہیں۔ جس میں اینٹ اور گچھ بھی استعمال

(ابن حوقل ص۲۶۹) — کیا گیا ہے۔

دوسری جگہ پھر اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ:۔

والری مدینۃ لیس بعد بغداد — رے مشرق کا اتنا بڑا شہر ہے کہ بغداد کے بعد

بالمشرق مدینۃ اعمر منھا الا — مشرق میں اسکی بڑائی کا کوئی دوسرا شہر مقابلہ

ان نیشاپور اکبر منھا عرضنہ — نہیں کرسکتا ہاں صرف نیشاپور اپنے طول

(ابن حوقل) — وعرض میں اس سے بڑا ہے۔

مگر عمارتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اسکے متعلق بھی وہی کہتا ہے کہ

والغالب علی بناءھا الطین — عمارتوں میں زیادہ تعداد انہی کی ہے جو

(ابن حوقل ص۲۶۵) — مٹی سے بنائی گئی ہیں۔

اسی طرح ہمدان کے ذکر میں بھی لکھا ہے:۔

"یہ بنا بسایا ہوا اسلامی شہر ہے۔ اسکی چاروں طرف فصیل بھی ہے۔ چار دروازے ہیں۔ جن پر لوہے کے پھاٹک جڑے ہوئے ہیں۔ لیکن عمارتیں یہاں کے باشندوں کی مٹی ہی کی ہیں۔ انکے یہاں بھی پانی کی کثرت ہے۔ باغوں سے بھرا ہوا ہے۔ بہتے ہوئے چشموں سے کھیتی ہوتی ہے۔" (ابن حوقل ص۲۶۱)

اپنے زمانے کے اصفہان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"عراق سے خراسان تک رے کے بعد اصفہان سے بڑا کوئی شہر نہیں ہے۔"

اسی اصفہان اور اس کے ایک محلّہ کے متعلق جس میں کسی زمانے میں یہودی رہتے تھے۔ اس لئے اس حصے کا نام یہودیہ پڑ گیا تھا اور دوسرے محلے کا نام شہرستانہ تھا۔ بہرحال دونوں ہی کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ:۔

"الجبال کے علاقہ کا سب سے زیادہ زرخیز سیر حاصل خطہ ہے، بہت وسیع ہے۔ آبادی۔ دولت۔ تجارت۔ ہر قسم کی سہولت۔ فواکہ میوہ جات۔ الغرض جس لحاظ سے دیکھو الجبال میں اسکے مقابلہ کا کوئی دوسرا شہر نہیں ہے۔"

مگر باوجود ان تمام باتوں کے

بناءٌ ھمامن طین اصفہان کے دو محلوں (یہودیہ اور شہرستانہ) دونوں کی عمارتیں مٹی کی ہیں

اور میں کہاں تک مثالیں دیتا چلا جاؤں۔ انتہا یہ ہے کہ سجستان کا مرکزی شہر جس کا نام ابن حوقل نے زرنج بتایا ہے اور لکھا ہے کہ:۔

"اس علاقے کا سب سے بڑا شہر زرنج ہے۔ یہ بھی فصیل رکھتا ہے عمارتیں اسکی وسیع ہیں۔ مکانوں کی کثرت ہے اسی میں علاقے کا دارالامارت ہے۔ خندق جو فصیل کے چاروں طرف ہے اسی کے اندر ایک چشمہ ہے اور دوسرے چشمے بھی اسی میں آکر گرتے ہیں۔ پانچ دروازے ہیں۔"

پھر ہر دروازے کا نام اور اس کی صفت بیان کرنے کے بعد اسی نے لکھا ہے کہ اس علاقے کی آب و ہوا ایسی ہے کہ لکڑیوں میں فوراً گھن لگ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کے لوگ اپنے مکانوں میں لکڑی نہیں خرچ کرتے۔ مگر باوجود اس کے بھی

ابنیتہا کلہا طین آزاج معقودۃ (ص ۲۹۸) — سارے مکانات اس علاقے کے بھی مٹی کی کہگل کے ہوتے ہیں۔

مقصود اس طول بیانی سے یہ ہے کہ سلاطین و ان کے ولاۃ و حکام کے مقابلہ میں مسلمانوں کا مذاق تعمیر کے متعلق عجیب معلوم ہوتا ہے مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ایک طرف تو قرآن

أتبنون بكل ريع آية تعبثون ۝ وتتخذون مصانع لعلكم تخلدون (سورۃ الشعراء)

کیا تم ہر اونچے مقام پر بے ضرورت یادگاریں بناتے اور بڑے بڑے محل تعمیر کرتے ہو۔ گویا تمہیں دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔

کی کڑکتی ہوئی آواز میں "الحیوۃ الدنیا" کی حقیقت جو واضح کر رہا تھا یعنی یہاں اس قسم کا کوئی کام کرنا جس سے معلوم ہوتا ہو کہ کام کرنے والے کو اپنے متعلق شاید خلود اور واقعی بقائے دوام کا مغالطہ لگ گیا ہے، بدترین حماقت ہے اسلئے قرآنی روشنی میں اس قسم کی حماقتوں سے بچکر وہ خود بھی آرام سے رہنا چاہتے تھے اور اپنے مہمانوں اور عام مسافروں کو بھی آرام پہنچانا چاہتے تھے۔ دونوں مسئلوں میں تطبیق دینے کی یہی شکل ہو سکتی تھی کہ بنانے کیلئے یوں تو وہ بڑے بڑے مکان۔ اونچی اونچی دیواریں اور اونچے اونچے دروازے اور طویل

وغیرہ کرکے بناتے تھے۔ گذر چکا کہ ایک ایک مکان میں دو دو سو آدمیوں کی گنجائش ہوتی تھی۔ اتنے ہی بڑے بڑے مکان بخارا میں بھی ملتے ہیں اور مصر میں بھی۔ لیکن اسی کو ثابت کرنے کیلئے کہ بنانے والے کو غلود کا مغالطہ نہیں لگا ہے۔ عموماً مٹی یا زیادہ سے زیادہ اینٹوں اور گچ تک وہ پہونچتے تھے، یہ ہو سکتا ہے کہ مٹی کے ان مکانات کے متعلق کوئی طبی نقطۂ نظر بھی ان کے سامنے ہو۔ ابن الفقیہ جو تیسری صدی ہجری کا مصنف ہے صحت و حفاظت کے لحاظ سے مکانوں کے متعلق مسلمانوں میں کس قسم کے خیالات اس زمانے میں پھیلے ہوئے تھے ان ہی کو ظاہر کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ:-

"مکان بنانے کا بہترین محل وسو قعہ ٹیلہ اور بلند جگہ ہے۔ تاکہ اس میں رہنے والوں کی نگاہ نیچے کی چیزوں پر پڑتی رہے۔ اسی طرح مکانوں کے رخ اور دروازے، کھڑکی وغیرہ کیلئے بہترین سمت مشرق ہے، کیونکہ بدن کی صحت پر اس کا اچھا اثر اس لئے پڑتا ہے کہ آفتاب کی شعاعوں اور اس کی روشنی سے استفادے کا موقعہ اس قسم کے مکانات میں بہت جلد حاصل ہوتا ہے چاہیئے۔ کہ مکان جب بنائیں تو وہ کشادہ ہوں اور بلندی ان میں کافی رکھی جائے اور اس کا تو ہمیشہ خیال کرنا چاہیئے کہ دروازہ جب مکان کا ہو تو مشرق ہی کی طرف ہو۔"

(الابن الفقیہ الہمدانی ص۱۰۳)

کیا تعجب ہے کہ مٹی کے مکان کے متعلق مسلمانوں کا یہی خیال ہو کہ گرما و سرما ہر قسم

کے موسم میں وہ عافیت بخش ہوتا ہے۔ گرمیوں میں زیادہ تپتا نہیں ہے۔ اور سردیوں میں حد سے زیادہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ البتہ مٹی کے مکانوں کے لئے ایک چیز کی سخت ضرورت ہے یعنی اسکی صفائی، لیپ، پوت کی طرف پوری توجہ رکھنی پڑتی ہے اور آپ دیکھ چکے ہیں۔ ماوراء النہر کے مسلمانوں کا اس باب میں ابن حوقل نے کیا حال بیان کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے تعمیری مذاق کی اس خصوصیت پر جب سے مجھے تنبّہ ہوا ہے ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں پہونچنے کے بعد بیان کرنے والوں کی زبانی مختلف قصبات و دیہات کے متعلق اس قسم کی باتیں جب سننے میں آتی ہیں کہ عہدِ اسلامی میں اس بستی کے لوگ بڑے خوشحال تھے۔ اتنی سواریاں روزانہ نکلا کرتی تھیں۔ یہ تھا وہ تھا۔

لیکن عموماً اس قسم کے مقامات میں خاک کے ایک بڑے تودے کے سوا چونکہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے دل سوال کرتا ہے کہ اگر واقعی یہاں کے باشندے کسی زمانہ میں فراغبالی اور امارت و ریاست کی زندگی بسر کرتے تھے تو ان کے مکانوں کے ٹوٹے پھوٹے آثار تو کہیں ملنے چاہئیں۔ لیکن بجز خاص خاص بستیوں کے جہاں اب بھی پتلی اینٹوں کی بڑی بڑی حویلیاں اپنے بنانیوالوں کی عظمت و شان کی نوحہ خوانیوں میں مصروف ہیں۔ عموماً "تودۂ خاک" کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ملتی تھی۔ اور جیسا کہ اس زمانہ میں یہ باور کرا دیا گیا ہے کہ اپنے اسلاف کے حالات کے بیان کرنے میں مسلمان عموماً مبالغہ بلکہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں یہ خیال گزرتا تھا کہ شاید یہ بھی اسی قبیل کی چیز ہو۔

لیکن بحمد اللہ جب سے مسلمانوں کے اس عام تعمیری مذاق کا علم ان مؤرخین کے ذریعے سے ہوا ہے مسئلہ واضح ہو گیا۔ واقعہ یہی تھا کہ عموماً مسلمان خام یعنی کچے مکانوں ہی کے بنانے کے عادی تھے۔ امارت اور غربت کا فرق مکان کے طول و عرض وسعت و کشادگی سے نمایاں ہوتا تھا۔ ورنہ مٹی سے بنانے میں امیر ہوں یا غریب دونوں برابر تھے۔

مسلمانوں کی بعض پرانی بستیاں جو اب ویران ہو کر کھنڈر بن چکی ہیں۔ ان میں اب بھی جا کر آپ دیکھ سکتے ہیں۔ بڑی بڑی اونچی دیواریں اُن کی آپ کو نظر آئیں گی لیکن ہوں گی وہ دیواریں مٹی ہی کی۔

مکان کے مسئلہ میں مسلمانوں کا عام مذاق جیسا کہ بیان کر چکا ہوں یہ تھا کہ وسعت و کشادگی اور فرحی کے لحاظ سے تو وہ ایسے ہوتے تھے کہ دو دو سو ہاتھیوں تک کے اتارنے کی گنجائش آن واحد میں ایک ایک مسلمان کے گھر میں نکل آتی تھی۔ اسی کے ساتھ ہوا اور روشنی کا بھی معلوم ہوتا ہے کہ عموماً خیال رکھا جاتا تھا لیکن جیسا کہ میں نقل کر چکا ہوں با اینہمہ ہوتے تھے اکثر و بیشتر یہ مکان مٹی ہی کے۔ میں نے کہا تھا کہ ویران ہونے کے بعد یہی وجہ اس بات کی شاید ہے کہ مسلمانوں کی بستیاں کھنڈروں کی شکل میں نظر نہیں آتیں بلکہ جہاں سے اٹھ کر کسی وجہ سے دوسری جگہ لوگ منتقل ہو جاتے تھے تو وہی مٹی جو دیواروں اور مکانوں کی دوسری چیزوں میں اٹھا کر لگائی جاتی تھی پھر زمین ہی میں واپس ہو کر زیادہ سے زیادہ کسی ٹیلہ کی شکل اختیار کر لیتی تھی لیکن ایسے ویران کھنڈر جنہیں دیکھ کر آدمی کو وحشت ہو اور خواہ مخواہ اس طرف منتقل ہو کہ ان میں بھوت اور

جن رہتے ہیں۔ عموماً مسلمانوں کی عام آبادیاں اس شکل کو اختیار نہیں کرتی تھیں۔ الا ماشاء اللہ۔

قدیم شہروں کے خرابے مثلاً بعل بک۔ اصطخر۔ اور مصر وغیرہ کے پرانے ویران شہروں کو دیکھ کر یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے عوام عموماً ان کے متعلق خیال کر لیتے تھے کہ جنوں اور دیوؤں کے بنائے ہوئے ہیں۔

الہمدانی نے ایک موقعہ پر یہ قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ لُد کے کسی شخص سے ہم نے کہا کہ تمہارے یہاں یہ بڑے بڑے کوہ ہیکل مکانوں کے کھنڈر جو دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں کیا جنوں نے سلیمان کیلئے انکو بنایا تھا اس پر اس شخص نے جو غالباً عیسائی یہودی تھا کہا کہ تم مسلمانوں کا عجیب حال ہے کہ جب کوئی ایسی عمارت کہیں نظر آتی ہے جو تمہارے خیال میں غیر معمولی ہوتی ہے تو اُس کو تم لوگ جن اور شیاطین کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہو۔ (الہمدانی ص۱۱)

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو مقابر کے متعلق جو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں کچی رکھیں اسکا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ پختہ قبروں والے قبرستان امتدادِ زمانہ سے ٹوٹی پھوٹی قبروں۔ گری پڑی چھتوں اور اکھڑے ہوئے تعویذوں وغیرہ کی وجہ سے کچھ ڈراؤنے سے ہو جاتے ہیں۔ کچے قبرستانوں میں یہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ بس آدمی جس مٹی سے پیدا ہوا تھا اُسی میں واپس کر دیا گیا کچھ دن قریب قریب کے رشتہ داروں کی تسلی کے لئے ذرا قبر کی پشت نمایاں کر دی جاتی ہے۔ لیکن عموماً ایک دو پشت کے بعد پھر کسی کو خیال بھی نہیں رہتا کہ اُس کی اُوپر والی پیڑھیوں والے کون لوگ تھے اور کہاں مرے کہاں

دفن ہوئے۔ فراموشیدگی اور نسیان کے اس عہد کے آنے تک کتنی قبرستان کے
کو ہاں بھی ذہن سے برابر ہو جاتے ہیں۔ اور پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہاں
لوگوں کی قبریں تھیں بھی یا نہیں۔

بہرحال جہاں تک قرائن و قیاسات کا اقتضا ہے۔ میں ان ہی کی بنیاد پر
یہ کہنا چاہتا تھا کہ منجملہ دیگر اغراض کے اپنے مکانوں کی تعمیر میں عموماً مسلمان
پردیسی مسافروں اور مہمانوں کا بھی خاص طور پر خیال کیا کرتے تھے المقریزی
نے صرف مصر کے مسلمانوں کا یہ حال بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"صاحبِ مقدرت گھرانوں میں قاعدہ ہے کہ کھانا عموماً ضرورت
سے زیادہ اس لئے پکوایا جاتا ہے کہ وقت پر اگر کوئی مہمان یا
مسافر آجائے تو اسے تکلیف نہ ہو۔ اور زائد از ضرورت کھانے کی
مقدار بھی کافی ہوتی ہے۔ اگر اس دن مہمانوں یا مسافروں کا کوئی
حصہ نہیں پہنچا ہے تو نوکر چاکر اسے لیجاتے ہیں۔ اور اپنے بال بچوں
میں تقسیم کرتے ہیں۔ یا اس کو بیچ کر پیسے کھرے کر لیتے ہیں۔"
(المقریزی) صفحہ ۲۱۸/۱)

یہ بات کہ اس دستور کا تعلق کچھ مصر کے خوش حال مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص
نہ تھا۔ اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ہندوستان تک کے مسلمانوں میں اپنی حکومت
کے آخری دنوں تک ہم اس دستور کے آثار و نتائج کو محسوس کرتے ہیں۔
مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ امیر الامراء حسین علی خاں جس زمانے
میں اورنگ آباد کے صوبہ دار تھے ان کے باورچی خانے میں اتنا کھانا پکتا تھا

کہ عام طور پر ایک پیسہ میں اُن کے نوکروں سے بریانی کا ایک ۔۔۔ قاب لوگوں کو مل جاتا تھا۔ خود حیدر آباد کے اربابِ نعمت وثروت کا تماشا آج سے تیس چالیس برس پہلے جن لوگوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا ہے وہ اب بھی اسکی شہادت ادا کرتے ہیں کہ ان گذرے ہوئے امیروں کے بطبخ کا عام دستور یہی تھا۔ یہی وجہ اس بات کی ہے کہ مغربی تمدن کا قدم جب تک راسخ نہیں ہوا تھا۔ آپ کو حیدر آباد میں اس قسم کے بڑے بڑے ہوٹل، کیفے نہیں مل سکتے تھے۔ جن سے آج اس شہر کا گوشہ گوشہ معمور ہے۔ دراصل مہمان نوازی اور مسافر پروری کے عام دستور نے کرا یہ کے ان طعام خانوں اور قیام خانوں کی ضرورت ہی پیدا ہونے نہیں دی تھی۔

خیر میں پھر دوسرے مسئلہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ گفتگو مکانوں کے متعلق ہو رہی تھی۔ میرے دعوے کی تائید میں ابنِ حوقل ہی کا وہ بیان بھی قابلِ توجہ ہے جو ماوراء النہر ہی کے سلسلہ میں اس نے بیان کیا ہے کہ۔

> "تم عموماً یہاں کے اربابِ ثروت و نعمت کو پاؤ گے کہ اپنی دولت کا بہت بڑا مصرف ان لوگوں کے نزدیک اس قسم کی باتیں ہیں۔ مثلاً سرائیں بنوانی، راستوں کو درست کرنا۔ اور پلوں کی تعمیر، عام حال یہی ہے۔ چند استثنائی صورتوں میں نہیں کہتا۔"

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ:۔

لیس من بلاد ولا طریق مطروق	کوئی شہر یا کوئی گذرگاہ جس میں لوگوں کی
ولا قریۃ آھلۃ الا وفیھا	آمد و رفت ہو یا کوئی آباد گاؤں ایسا
من المرباطات ما یفضل عن	نہیں ہے جس میں بڑی بڑی سرائیں بنی

من ينزل به ممن يطرقه — ہوئی نہیں ہیں۔ اتنی بڑی کاتر نیوالوں
(ابن حوقل ص۳۳۹) — کے بعد بھی جگہ اسمیں باقی رہتی ہے۔

پھر ان رباطوں یعنی مسافر خانوں اور سراؤں کے اعداد و شمار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ صرف اس علاقہ میں (ماوراء النہر میں) دس ہزار سے اوپر رباطات (سرائیں) ہیں۔"

اور کیسے رباطات؟ اسی کے الفاظ ہیں:۔

في كثير منها اذا نزل — بہت سی سرائیں تو ایسی ہیں جن میں
النازل أقيم علف دابته — اسکا انتظام ہے کہ مسافروں کو اوران کے
وطعامه — جانوروں کو کھانا چارہ سرائے ہی کی
(ایضاً ص۳۳۹) — طرف سے دیا جاتا ہے۔

پانی پلانیکا انتظام اور رفاہ عام کے اوقاف

اور گو اس زمانہ میں ہر جگہ اسکا انتظام ناممکن تھا لیکن ابن حوقل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ماوراء النہر میں علاوہ قیام وطعام کے مسلمانوں نے مسافروں اور عام راہ گیروں کے لئے فیاضی کے ساتھ جس چیز کا نظم کر رکھا تھا وہ برف کا پانی تھا۔ میں بجنسہ ابن حوقل کے الفاظ نقل کر دیتا ہوں، لکھتا ہے اور اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے۔

وقل ما رأيت خانا او طرف	اور میں نے ایسا بہت کم دیکھا کہ کہیں سرائے
سكة او محلة او مجمع ناس	ہو یا سڑک کا موڑ یا ناکہ ہو۔ یا کوئی محلہ
الى حائط لم تخلو	ہو یا کسی دیوار کے کنارے (سایہ لینے
من ماء جمد مسبّل[1]	کیلئے) لوگ جمع ہوتے ہوں۔ وہ برف
(ابن حوقل ص۳۲۲)	کے پانی کی سبیل سے خالی ہو۔

سلہ مسبل کا لفظ بہ ظاہر سبیل ہی سے بنا لیا گیا ہے، اللہ کی راہ میں ثواب کی نیت سے کوئی کام کرنا تسبیل کے معنے لغت میں یہی لکھے ہیں منتہی الارب میں ہے سبّلا تسبیلاً (دریافت آنرا در راہ خدای تعالیٰ) متأخرین نے برف بنا لیا تھا عام طور پر اگرچہ یہ رواج اس زمانے میں نہیں تھا لیکن جن ممالک میں سردیوں کے زمانے میں برف پڑتی تھی۔ اور سردسیر ممالک کا یہ عمومی حال ہے۔ ماوراء النہر بھی انہی علاقوں میں ہے۔ جیسا کہ میں نے براہ راست اپنے رفقاء درس سے جو بخارا و سمرقند کے رہنے والے تھے سنا ہے کہ سردیوں کے موسم میں لوگ بڑے بڑے گہرے گڑھوں اور خندقوں میں برف کو کاٹ دیتے ہیں۔ پھر جب گرمی کا موسم آتا ہے تو ان ہی گڑھوں سے نکال نکال کر خرچ کرتے ہیں۔ بے ساختہ اس وقت زندگی کے وہ پرانے دن یاد آ گئے۔ جب کہ دیوبند میں یہ فقیر طالب علمی کرتا تھا۔ میرے ساتھ یہ عجیب حسن اتفاق ہوا کہ جہاں کہیں رہا۔ بخارا، سمرقند، ہرات، ترمذ، کابل، قندھار کے طلباء سے عموماً میرے دائم دوستانہ ہو جاتے تھے زیادہ تر ان علاقوں سے میری دلچسپی ان ہی لوگوں کی صحبت اور طویل رفاقت کا نتیجہ ہے۔ ان میں بعض میرے ہم درس تھے اور بعض خصوصی طور پر مجبور کر کے مجھ سے پڑھتے تھے۔ توران (روس) کے ایک بزرگ عاصم بیگ جب دیوبند میں شروع شروع آئے اور اردو سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ تو منطق اور فلسفہ کی کتابیں بطور مشغلہ کے عربی زبان (باقی آگے)

اور یہ تو ابن حوقل کی عینی شہادت ہے۔ اسی کے بعد سنی ہوئی ایک روایت

(باقی پچھلا) کے توسط سے وہ مجھ سے پڑھتے رہے۔ یہ ایک روشن خیال روسی ترک تھے۔
فوج سے بھاگ کر مکہ معظمہ چلے گئے اور مکہ معظمہ سے ہندوستان آگئے۔ ہندوستان میں تلاش
کرکے دیوبند کو اپنا ٹھکانہ انہوں نے بنا لیا تھا۔ اخبار پڑھنے کا ان کو بہت شوق تھا اردو
نہیں آتی تھی۔ بہت الجھتے تھے آخر میں بہت جلد اردو سمجھنے لگے۔ زار کی حکومت کا جب تختہ الٹ
رہا تھا اور بولشویک اقتدار تام کی آخری خبر جس دن اخباروں میں چھپی تو باوجود باوقار آدمی
ہونے کے واقعہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ وہ ناچ رہے ہیں۔ شورائی حکومت سے ان کے بڑے
توقعات تھے جو غالباً غلط ثابت ہوئے۔ اس کے بعد وہ وطن چلے گئے پھر پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے۔ اسی
طرح ٹونک میں ایک نوجوان بہت ہی خوش رو سبزہ آغاز طالب علم معلوم نہیں کہاں
سے بھٹک کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ یہ شاش کے رہنے والے تھے۔ جسے اب تاشقند
کہتے ہیں۔ باوجود حسین ہونے کے اس شخص کے چوڑے بڑے پنجے اور مجموعی ہیئت کذائی
اتنی خوفناک تھی کہ دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ یہ بھی یاد نہیں کہ نظامیہ درس کی ابتدائی کتابیں قطبی
شرح تہذیب۔ کنز وغیرہ مجھ ہی سے پڑھتے تھے۔ فارسی ذریعہ تفہیم تھی۔ غضنفر نام رکھا گیا
تھا۔ ہمیشہ اسی وہم میں رہتے کہ غریب الوطن ہونے کی وجہ سے لوگ مجھ سے بے اعتنائی
برتتے ہیں۔ ادنیٰ شبہ پر آپے سے باہر ہو جاتے اور منہ لٹکا لیتے تھے۔ اسی لئے میں نے مزاحاً ان کا نام غضبان
رکھ چھوڑا تھا اور اسی نام سے وہ مشہور ہو گئے۔ حتیٰ کہ اصلی نام ان کا مجھے یاد بھی نہیں
رہا۔ وہ ہفتہ میں کم از کم ایک دفعہ مجبور کرتے کہ "کنڈر پلاؤ" جو خاص طریقے سے وہ
پکاتے تھے۔ وہ ان سے پکواؤں۔ بہت جلد تیار کر لیتے تھے۔ گاجر کو کدوکش کر کے
چاول میں ملا لیتے تھے۔ اور کچھ دوسرے مصالحوں کے ساتھ گوشت، یہ واقعہ ہے کہ ایسا
(باقی آگے)

یہ درج کی ہے کہ:-

(باقی پچھلا) ساری عمر میں مولوی غضبان کے گذر پلاؤ کی لذت مجھے دنیا کے کسی کھانے میں نہیں ملی۔ میں نے اُنکو ایک دن دیکھا کہ بیٹھے رو رہے ہیں۔ مولانا غضبان! کیا ہے؟ چیخ مار کر کہنے لگے حضرت اُستاد! آج گرمی کے موسم میں بے ساختہ مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے یہی موسم ہے جس میں ہمارے یہاں عموماً دستور ہے کہ لوگ دو مہینے رہنے کیلئے اپنے باغوں میں چلے جاتے ہیں۔ عورتیں بچے سب ساتھ باغ ہی میں رہتے ہیں۔ بہتے ہوئے چشموں سے سیراب درختوں میں خصوصاً سیب جنکی بیسیوں قسم تیار ہوتے تھے اور طرح طرح کے پھل دنبہ کا گوشت، چشمے کا پانی، بس یہی اس زمانے کی غذا اور پھلوں کی نگرانی یہ ہم لوگوں کا کام ہوتا ہے۔ میرے بھائی اور بہنیں والدہ، والد سب باغ میں ہونگے اور میں بدقسمت اس سنگستان اُجڑے دیار راجپوتانہ میں ہوں۔ میں اُنکو قصے سُنا سُنا کر تسلی دیتا تھا۔ بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ ان کا بھی حال معلوم نہ ہو سکا کہ کیا ہوئے دیوبند میں مولانا عبد الحکیم بخاری حدیث کے دورے میں میرے ساتھی تھے۔ اللہ اللہ ان کے اخلاق کریمانہ، مجھ سے عمر میں بہت زیادہ تھے لیکن سبق سے واپس آنے کے بعد مجھ سے کہتے کہ اُستادوں سے سُنی ہوئی تقریروں کو پھر تم سمجھا دو۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے درس کا نوٹ عربی میں میں التزاماً لکھا کرتا تھا۔ ضخیم مجلد کی شکل اُسنے اختیار کر لی تھی۔ مولوی عبد الحکیم نے حرف بحرف اسکو نقل کیا تھا۔ کہا کرتے کہ ہمارا سبق پھر اسی کے ذریعہ سے تیری یاد کو تازہ کرتا رہیگا۔ باوجود مسافرت اور غریب الوطنی کے ہمیشہ کچھ نہ کچھ پکا کر کھلایا کرتے۔ ایک قسم کا پلاؤ یہ بھی پکاتے تھے۔ میرے سمرقندی دوست نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ اب وہاں کا حال کیا پوچھتے ہو۔ بہت بڑا مشغلہ شہر والوں کا یہ رہ گیا ہے کہ کسی خاص میدان میں لوگ انڈے لے لے کر اکٹھے ہوتے ہیں اور ان ہی کو لڑاتے ہیں جس کا انڈا ٹوٹ جاتا ہے وہ اپنا انڈا ہار جاتا ہے

(باقی آگے)

"ایسے آدمی سے جن کی خبر پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم

سب سے زیادہ یہ ہمارے ماوراء النہر کے احباب اپنے ملک کی جس بات کے شاکی تھے
وہ اس ملک کی اخلاقی پستی تھی۔ علماء تک کا کردار جیسا کہ انہی لوگوں کا بیان تھا ناگفتہ بہ
حد تک برباد ہو چکا تھا۔ میں ان سے پوچھتا تھا کہ سارا علم تو ہندوستان میں اس علاقے
سے آیا۔ بخاری شریف بخارا میں لکھی گئی۔ شفا اور اشارات کا مصنف بھی بخاری ہے
لیکن یہ کتابیں چھپتی ہندوستان میں ہیں۔ وہاں کے مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ قرآن تک چھپا
ہوا بخارا کا نظر سے آج تک نہیں گذرا۔ نہ کوئی مصنف پیدا ہوا ہے، نہ مدرس نہ شاعر
تو گردن جھکا لیتا اور اسکی توجیہ میں وہ ایسی باتیں بیان کرتے تھے کہ کلیجہ کانپ جاتا تھا۔
واقعہ یہ ہے کہ ان ممالک پر جو مصائب آئے ہیں ان میں غیروں کے ساتھ ساتھ خود ان کے
مظالم کو بھی دخل ہے۔ خدا کرے کہ مصیبت کا پہاڑ جو ان پر ٹوٹا ہے وہ انکی بیداری کی
وجہ بن جائے۔ بہر حال کچھ بھی ہو تو اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام اور پیغمبر اسلام سے
ان کا اعتقادی رشتہ مسلمانان ہند سے کسی طرح کم مضبوط نہیں نظر آتا۔ میں یہ ماننے
کے لئے قطعاً تیار نہیں ہوں کہ ماوراء النہر کے سارے مسلمان مرتد اور دہریے ہو گئے
ہیں۔ کاش! خدا کا کوئی بندہ ان ممالک کے مسلمانوں کی صحیح رپورٹ لاتا۔ بے ساختہ دماغ
میں اسوقت یہ خیالات موجزن ہو گئے اور خواہ مخواہ قلم تک آ گئے۔ معلوم نہیں
ان لوگوں پر کیا گزری۔

قصبہ قراتگین نواح بخارا کے مولانا عبدالرحمٰن اور کابل کے مولانا حفیظ اللہ
کی یاد شاید دن میں ایک دفعہ تو ضرور آ جاتی ہے۔ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ رَبَّنَا کَانُوا۔ ۱۲

ہوا ہے کہ شہر سمرقند کی فصیل کے احاطہ میں دو ہزار سے زیادہ مکان ایسے ہیں جن میں برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی مفت بہم پہونچتا ہے اسکے لئے اوقاف ہیں۔ اور ان ہی اوقاف کی طرف سے سقایے بنے ہوئے۔ کہیں مستی اور کسی جگہ مٹی کے بڑے بڑے خم اور مٹکوں میں پانی روزانہ بھروا دیا جاتا ہے اور لوگ ان سے نفع اٹھاتے ہیں[1]۔

---

[1] اوقاف اور ان کے مصارف کی مختلف نوعیت کے لحاظ سے مسلمانوں کی تاریخ میں عجیب چیزیں ملتی ہیں۔ یہاں تو خیر برف کے پانی کیلئے وقف کا ذکر ہے۔ اس قسم کے اوقاف دمشق میں بھی تھے اور مراکش میں بھی۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ دمشق ہی میں ایک وقف کا مصرف صرف یہ ہے کہ کسی غلام سے اگر چینی کے برتن ٹوٹ جائیں تو فوراً غلام کی طرف سے اس برتن کا معاوضہ برتن ہی کی شکل میں مالکوں کے پاس پیش کر دیا جائے۔ لکھا ہے کہ ہر سال اس وقف میں کافی ذخیرہ چینی کے ظروف کا اس لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح مختلف علاقوں میں غرباء کی لڑکیوں کی شادی کیلئے اوقاف ہوا کرتے تھے۔ ایک صاحب نے مکہ معظمہ میں اسلئے وقف کیا تھا کہ کتوں کو شہر مکہ میں نہ داخل ہونے دیا جائے اسی کا نظم ان کے وقف کی آمدنی سے کیا جاتا تھا۔ بعضوں نے اس لئے اوقاف کئے تھے کہ جن مسلمانوں کی عورتوں کے پاس زیور نہ ہوں۔ عاریتاً ان کو ضرورت کے وقت زیور دیئے جائیں۔ مکہ معظمہ ہی میں ایک وقف اس لئے تھا کہ تقریبات کے موقع پر فرش وفروش کا انتظام کیا جائے۔ مسلمان بچوں کی ختنہ کے لئے بعضوں نے ٹیونس میں وقف کیا تھا۔ دلچسپ وقف ٹیونس ہی میں ایک یہ تھا کہ سال کے خاص موسم میں ساحل ٹیونس پر ایک خاص قسم کی

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور سچ تو یہ ہے کہ جس ملک کی ہر سڑک اور ہر محلہ میں برف سے بجھے ہوئے پانی کا مفت انتظام تھا اُسی ملک کے کسی شہر کے چند ہزار گھروں کو بھی یہی پانی مفت اگر پہنچایا جاتا ہو تو تعجب کی کیا بات ہے۔ اور گو ابنِ حوقل نے ماوراء النہر کے حالات میں اس انتظام کا ذکر کیا ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہر وہ ملک جہاں آسانی برف کا بندوبست اُس زمانے میں ہو سکتا تھا۔ عام اربابِ خیر کی طرف سے اس قسم کی سبیلیں جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے قائم تھیں۔ ماوراء النہر کی شہادت تو آپ سُن چکے۔ امیر شکیب ارسلان نے حاضر العالم الاسلامی

(باقی حاشیہ) لذیذ مچھلیاں نمایاں ہوتی تھیں۔ قیمت ان کی اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ ہر شخص خرید کر کھا نہیں سکتا تھا کسی امیر نے اسی لئے جائداد وقف کر دی تھی کہ اس کی آمدنی سے یہ موسمی مچھلیاں غرباء کو مہیا کی جائیں۔ ایک اور لطیف وقف اس مقصد سے کیا گیا تھا کہ میاں بیوی میں کسی سے اگر جھگڑا ہو جائے اور بیوی روٹھ کر میاں کے گھر سے باہر ہو جائے تو جب تک دونوں میں میل نہ ہو بیوی کے مصارف اس وقف سے ادا کئے جائیں ایسی عورتوں کے لئے ایک مکان بھی مراکش میں بنا ہوا تھا جس کا نام دار الدقہ تھا مراکش میں ایک اور بڑا وقف ان لوگوں کی خبر گیری کیلئے ہے جو مجنون اور دیوانے ہو جائیں (؟) اور یہ کہ شہر کے غرباء میں ہر سال موسم سرما میں کپڑے تقسیم کئے جائیں۔ ایک فرانسیسی سیاح نے مراکش ہی کے متعلق لکھا ہے کہ وہاں ایک اسلامی وقف ہے جس کے مصارف سے اتنا بڑا مکان بنایا گیا ہے جس میں اسی سیاح نے دیکھا کہ چھ ہزار اندھوں کو پناہ ملی ہوئی تھی ان کے کھانے پینے لباس اور تمام ضرورتوں کا کفیل وقف تھا غرض کہ کوڑھیوں، مسند وروں، بیماروں وغیرہ کیلئے اوقاف کی فہرست اسلامی ممالک کی بہت طویل ہے ۱۲ (دیکھو حاضر العالم الاسلامی کا حاشیہ از شکیب ارسلان صفحہ ۲۹۳/۱)

کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ:۔

وفی مدینۃ مراکش وقف لسقی الماء الثلوج فی ایام القیظ کما فی دمشق۔ (ص ۲۹۲ ج ۱)	شہر مراکش میں اس کام کے لئے ایک وقف ہے کہ برف کا بجھا ہوا پانی گرمیوں کے موسم میں لوگوں کو پلایا جائے۔ دمشق میں بھی اسی غرض سے اوقاف تھے۔

دمشق کے متعلق امیری نے لکھا ہے کہ علاوہ برف کے پانی کے بعض سبیلوں میں خروب کا پانی بھی پلایا جاتا ہے [1]۔

آپ نے دیکھا اسلامی ممالک کے اس زمانے میں یہی حدود تو تھے ایک طرف مشرق میں سمرقند و بخارا تھا، دوسری طرف مراکش اور بیچ میں دمشق تھا۔ دیکھ رہے ہیں کہ تینوں مقامات میں مسلمانوں کا ایک ہی مذاق ہے۔ اور راستہ میں سراؤں مہمان خانوں کا انتظام، ان میں عام مسافروں کے قیام و طعام کا نظم کون نہیں جانتا کہ علاوہ عام مسلمانوں کے خود حکومت اپنی بہت بڑی اہم ذمہ داری اسکو سمجھتی تھی۔ مسلمانوں کا ایسا کونسا ملک ہے۔ جس کی تاریخ میں حکومت کے اس نظم کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ آج وہ نظم درہم برہم ہو گیا۔ لیکن جہاں کہیں تھوڑا بہت اس کا موقعہ باقی ہے کہ آزادی کے ساتھ اپنے اسلامی احساسات کو عملی شکل مسلمان عطا کر سکتے ہیں وہاں اب بھی کچھ نہ کچھ اس کے آثار پائے جاتے ہیں۔

---

[1] خروب کی ایک خاص قسم جو شامی خروب کے نام سے مشہور ہے ایک قسم کا پھل ہے جسکے عرق سے وہاں شربت اور رُبّ (جام) وغیرہ بناتے ہیں ۱۲

طرابلس میں سنوسیوں کے زاویے

۱۹۱۰ء میں جب طرابلس کی جنگ چھڑی تو غازی انور پاشا کے ساتھ اور بھی چند باحمیت مسلمان طرابلس پہنچ گئے تھے۔ ان میں ایک امیر شکیب ارسلان بھی تھے۔ بعض مشاہدات کے معائنہ کا موقع ان کو اسی سلسلہ میں اس صحرائی علاقے میں تھا۔ جن میں ایک چیز سنوسیوں کے زاویے یا خانقاہیں تھیں، جن کا جال ہزاروں میل تک اس ملک میں ایک طرف سے دوسری طرف تک پھیلا ہوا تھا۔ ان زاویوں کی نوعیت کیا تھی؟ مختصراً اسکو بیان کرتے ہوئے پہلے تو ان زاویوں کی حالت بتائی ہے کہ:۔

"تقریباً ہر قبیلے میں ایک زاویہ ہے، زاویے کے متعلق آس پاس کی زمینیں ہوتی ہیں۔ ان زاویوں کے قیام کیلئے اس علاقے کا بہترین حصہ منتخب کیا جاتا ہے۔ زمین اس مقام کی عموماً زرخیز ہوتی ہے۔ انہیں بڑے گہرے عمیق کنوئیں بنے ہوئے ہیں جن کا پانی ختم نہیں ہوسکتا۔ جہاں جہاں یہ زاویے ہیں۔ ان سنوسی درویشوں نے اس مقام کو باغ و بہار بنا رکھا ہے۔ میں اپنے سفر کے سلسلے میں شاید کسی زاویہ سے نہیں گذرا جس کے متعلق میں نے کسی باغ کو نہ دیکھا ہو۔ بلکہ بعض زاویوں کے اطراف میں تو متعدد باغ اور بساتین نظر آئے۔ ان باغوں میں ہر قسم کے عمدہ کھانے والے پھلوں کو میں نے پایا۔ اور اسی کے ساتھ اطراف کی زمینوں میں

طرح طرح کی سبزیاں۔ ترکاریاں، لہلہا رہی تھیں۔ صحرا میں یہ نظارہ بڑا نزہت انگیز اور کیف آور تھا۔"

پھر لکھا ہے کہ:۔

"قاعدہ یہ ہے کہ جس قبیلے سے زاویہ کا تعلق ہوتا ہے اس قبیلے کے ہر مرد پر ایک دن یہ واجب ہے کہ زاویہ کے متعلقہ باغات اور زمینوں میں کام کرے۔ اس کی وجہ سے نظم بآسانی بہت ہی معمولی خرچ سے مکمل ہو جاتا ہے۔"

آخر میں جو بات لکھی ہے۔ اُسی کا پیش کرنا مقصود ہے۔ امیر لکھتے ہیں:۔

"یہ سنوسی زاویے اس وقت اس لق و دق صحرا میں مسافروں کی پناہ گاہوں کا کام تنہا انجام دے رہے ہیں۔ آنے جانے والے جتنے بھی ہیں ان کا ٹھکانہ یہی زاویے ہیں۔"

پھر خود اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ:۔

"میں جب طرابلس کے جہاد پر روانہ ہوا تو اسکندریہ سے ریل پر سوار ہو کر آخری مقام جہاں ریل کو میں نے وداعی سلام کیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے تقریباً ایک ماہ چل کر میں لڑائی کے مقام بن غازی تک پہنچا۔ پہلا زاویہ جہاں سے اس صحرائی سفر کا میرے آغاز ہوا۔ سیدی ہارون القماشی کا زاویہ تھا لیکن میں نے اپنے پورے اس سفر میں یہ پایا کہ منزل سے نکلنے کے بعد تین گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گذرنے پاتا تھا کہ کوئی نہ کوئی سنوسی زاویہ

میرے سامنے بڑا جاتا ہو۔ اور یہاں زاویوں کے سوا زاویے ہیں۔ جو سلطانی راستے سے ہٹ کر اندرون ملک میں بطور جال کے پھیلے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہاں تو نظم ہی یہ ہے کہ ہر قبیلے اپنا ایک مستقل زاویہ رکھتا ہے اور وہی اس کے دین و دنیا کا مرکز وحید ہے۔ بلکہ ایک ایک قبیلہ کی جو مختلف شاخیں ہیں ان شاخوں کا بھی اپنا اپنا الگ الگ زاویہ ہوتا ہے۔ مثلاً عبیدیلیا کا قبیلہ ایک بڑا قبیلہ ہے۔ اسکی مختلف شاخیں ہیں جو مختلف عائلوں کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں ہر عائلہ (خاندان) اپنا مستقل علیحدہ زاویہ رکھتا ہے۔ مثلاً عائلہ منصور کا زاویہ عائلہ مریم کا زاویہ، عائلہ جابریہ کا زاویہ۔

امیر کی جس چیز کو میں پیش کرنا چاہتا تھا وہ ان کے یہ آخری الفاظ ہیں کہ

وان الغریب، وابن السائل او الفقیر المعتر لینزل بزاویہ من هذا الزوایا فیقیم ما لبثاً ویضیف ما لبثا ولا یسألہ احد عن شئ (ص ۱۱۸)

مسافر، راہ گیر یا فقیر محتاج ان زاویوں میں سے کسی زاویے میں آ اترتے ہیں پھر جب تک ان کا جی چاہے اس وقت تک اس میں قیام کرتے ہیں اور کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ ان سے کوئی کچھ نہیں پوچھتا۔

اور یہی چیز مسلمانوں کے تمدن کا ایک امتیازی عنصر تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ طرابلس کے صحراء میں بھی حیوانی تمدن کے دباؤ نے کیا اس سلسلہ کو باقی رہنے کا موقعہ دیا، یا وہاں بھی ختم ہو چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے دور دراز

علاقوں کے درمیان آمد و رفت، تجارت اور بیوپار کا غیر منقطع سلسلہ مسلمانوں کے عہد میں جو جاری تھا۔ اس میں بہت زیادہ دخل مسافر نوازیوں کے اس عام دستور کو بھی تھا جسکے قیام میں عام مسلمانوں کے علاوہ خود اسلامی حکومتیں بھی بہت بڑا حصہ لیتی تھیں۔ آج تو عہد اسلامی کا نقشہ کچھ ایسے انداز میں کھینچا جاتا ہے کہ بری ہوں یا بحری، ہر قسم کے راستوں پر ڈاکو اور چور بیٹھے رہتے تھے۔ بچ کر کوئی مسافر اس زمانے میں منزل مقصود تک اگر اتفاقاً پہنچ جاتا تھا تو گویا یہ اسکی بہت بڑی خوش قسمتی تھی۔ کرانے والے بھی یہی باور کرا رہے ہیں اور باور کرنیوالوں نے بھی باور کر لیا ہے۔

بری اور بحری راستوں کی حفاظت کا انتظام

حالانکہ علاوہ ان خانات اور سرائیوں کے جن کا سلسلہ اسلامی ممالک کے طول و عرض میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ خود اسلامی حکومتوں کی طرف سے بھی راہگیروں اور مسافروں کی حفاظت میں بھی کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا تھا۔ یہی ابن حوقل جس کے معلومات سے میں اپنے اس مضمون میں زیادہ تر مستفید ہوا ہوں مشرق سے مغرب تک گھوما ہے لیکن اشارتاً و کنایۃً کہیں بھی اس نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے جس سے معلوم ہو کہ اس زمانے میں راستوں میں ڈاکو، چور، اچکے، مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ اپنی اس پوری کتاب میں بمشکل صرف ایک جگہ یعنی صحرائے خراسان کے راستوں کی جہاں اس نے تفصیل کی ہے۔ لکھتا ہے کہ:

"یہ ایسا لق و دق غیر آباد صحرا ہے کہ ان نشانات کے سوا جو حکومت کی جانب سے تھوڑی تھوڑی دور پر قائم کر دیئے گئے ہیں کسی اور چیز سے نہ منزل کا پتہ چل سکتا ہے، نہ مقام کا جسکی وجہ یہ ہے کہ علاوہ ان مقامات اور آبادیوں کے جو کہیں کہیں راستے میں مل جاتی ہیں، اس صحرا میں نہ زیادہ بستیاں ہی ہیں اور نہ اُن کے رہنے والے"

اور اسی کے بعد اس نے یہ ذکر کیا ہے کہ:۔

"دنیا کے تمام صحراؤں میں یہی ایک ایسا صحرا ہے جس میں نسبتاً چور اور بٹ مار زیادہ پائے جاتے ہیں"

مگر اسی کے بعد وجہ اس کی اُس نے جو لکھی ہے وہ بھی سنئے۔ لکھتا ہے جس کا حاصل یہ ہے:۔

"چوروں اور بٹ ماروں کی کثرت اس علاقے میں اس وجہ کر ہے کہ اس صحرا کا تعلق کسی خاص اقلیم اور علاقے سے نہیں کہ اگر یہ صورت نہ ہوتی بلکہ کسی خاص اقلیم اور علاقے سے اس کا تعلق ہوتا تو اس وقت اُس اقلیم کی حکومت اس کی ذمہ دار ہوتی کہ اس قسم کے فسادیوں سے پاک رکھے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس صحرا کے چاروں طرف مختلف اور متعدد حکومتوں کی سرحدیں پھیلی ہوئی ہیں۔ متعدد سلاطین کے قبضے میں صحرا کے اطراف کے یہ علاقے ہیں۔ یعنی بعض حصہ تو اس کا خراسان اور قومس سے متعلق ہے اور بعض سجستان سے اور بعض کا

تعلق کرمان وفارس ۔ اصفہان ۔ قم ۔ کاشان ، رے وغیرہ سے ہے۔"

آخری الفاظ اس کے یہ ہیں :-

فاذا افسد القاطع فی عمل دخل فی عمل آخر سلہ (ابن حوقل ص۲۸۸)	جب راہ زن کسی ایک علاقہ میں کوئی فساد برپا کرتے ہیں تو دوسرے علاقہ میں جاکر وہ پناہ گزین ہو جاتے ہیں۔

اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ "صحرائے خراسان" کی اس خاص خصوصیت کا نتیجہ یہ تھا کہ پوری قوت کے ساتھ فساد کا ازالہ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر با وجود اس کے خود ابن حوقل جیسا کہ اسی کا بیان ہے۔ دو دفعہ اس صحراء سے گذرا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ایک دفعہ تو اس نے لکھا ہے کہ اونٹوں کے قافلوں کے ساتھ میں گذرا ہوں اور دوسری دفعہ کے متعلق اس کا لفظ ہے کہ "مع المفردہ" گذرنے کی نوبت آئی۔ مفردہ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیدل مسافروں کی چھوٹی ٹولی کے ساتھ گذرا ہوگا۔ لیکن دونوں دفعہ اس کے ساتھ یا اس کے رفقاء کے ساتھ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

اب میں کیا کہوں کہ یہ مباحث میرے اس وقت کے موضوع سے خارج ہیں اس لئے ان کی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ ورنہ مسلمانوں کے زمانہ میں بلوچ

سلہ ابن حوقل نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس صحراء کے قریب ایک دشوار کوہستان بھی ہے جسے جبل کرکس کہتے ہیں۔ یہ جتنے مفسدین، راہ زن، چور ڈاکو ہیں ان کی پناہ گاہ (باقی اگلے صفحہ پر)

کی حفاظت اور صفائی مسافروں کے آرام کے متعلق جو جو انتظامات کئے جاتے تھے یہ بھی ایک طویل داستان ہے۔ بنی امیہ کی حکومت کا ابتدائی زمانہ ہے۔ حکومت کو اطلاع ملتی ہے کہ انطاکیہ اور مصیصہ کے درمیانی علاقے میں شیروں کی کثرت ہو گئی ہے۔ سننے کے ساتھ ولید بن عبدالملک نے جو اس وقت بادشاہ تھا۔ حکم دیا کہ شیروں کو شکار کر کے ختم کر دیا جائے۔ لکھا ہے کہ شیروں کو پھنسانے کیلئے جو بھینسے اور بھینسیں گڑھوں میں باندھی گئی تھیں انکی تعداد چار ہزار تھی۔ البلاذری کے الفاظ یہ ہیں کہ:-

فوجه اربعة آلاف جاموس — چار ہزار بھینسے اور بھینسیں اس طرف

باقی بھیجا) اسی کوہستان کی گھاٹیاں اور چوٹیاں ہیں۔ اسی میں وہ اپنی لوٹ اور چوری کے مال کو جا کر چھپا دیتے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ دیکھنے میں تو یہ کوئی بڑا پہاڑ نہیں ہے لیکن صحرا کے بیچ میں دوسرے پہاڑی سلسلوں سے بالکل [illegible] چونکہ اس کا محل وقوع ہے اس لئے تعاقب کرنے والوں کی رسائی میں دشواری ہوتی ہے۔ ابن حوقل نے لکھا ہے کہ ہم بھی اس پہاڑ کو تفصیل کے ساتھ نہ دیکھ سکے۔ بالکل اس کے دامن سے گزر گئے۔ غالباً اس پر بھی خوف طاری ہوگا۔ اس نے لکھا ہے کہ اسی وجہ سے میں اس کے تفصیلات نہیں بیان کر سکتا۔ ص۲۸۹۔ مقدسی نے بھی اپنی کتاب میں اس مفازہ کے چوروں اور راہ زنوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ کان البلوص اشر منہم (یعنی ان ڈاکوؤں اور چوروں میں سب سے زیادہ بلوچ تھے) لکھا ہے کہ سانپ کے سر کو پتھر سے جیسے لوگ کچلتے ہیں یہی سلوک یہ لوگ ان مسافروں کے ساتھ کرتے تھے جو ان کے ہاتھ آ جاتے تھے۔ مقدسی نے اپنے زمانہ کا حال لکھا ہے کہ دیلمی

(باقی اگلے صفحہ پر)

وجاموسة فنقم الله عزوجل (الہمدانی ص۱۱۳) | بھیجی گئیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے نقع پہنچایا (یعنی شیر اس علاقے کے ختم ہوگئے)

اسی ابنِ حوقل نے دریائے دجلہ کے انتہائی دہانہ کا جب وہ شط العرب میں گرتا ہے نہر ابلہ کے پاس لکھا ہے کہ وہاں پر خود عظیم الخطر ہے یعنی مختلف سمت سے سمٹ کر پانی کے جمع ہونے اور رواں ہونے کی وجہ سے گرداب عظیم کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا بیان ہے کہ:۔

ماء جسیم دائم الضرہا	یہاں پر پانی بھی بہت گہرا ہے۔ جس سے
وکانت اکثر السفن	ہمیشہ نقصان پہنچتا تھا۔ اکثر جہاز سمندر
تسلم من سائر الاماکن	کے تمام مقامات سے صحیح و سالم بچ کر
فی البحر حتی تنزد لہ	نکل آتے تھے۔ لیکن جوں ہی اس گرداب
فیبتلعہا وتغرق	میں آکر پھنس جاتے تھے تو ان کو وہ
وفیہ بعد ان تدور	نگل جاتا تھا اور جہاز ڈوب جاتے تھے
علے وجہ الماء ایاما	(ہوتا یہ تھا کہ اس گرداب میں) پانی کی
وکان یعرف بخور الابلۃ	سطح پر پہنچنے کے بعد جہاز کئی دن تک
(ابن حوقل ص۱۶۰)	گھومتا رہتا تھا۔ (آخر میں ڈوب جاتا تھا)

بادشاہ عضد الدولہ نے ان راہ زنوں کا قلع قمع کر دیا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ بطور برغمال کے ہر سال ایک خاص تعداد ان لوگوں کی فارس کی حکومت کے پاس رہتی ہے۔ ہر قافلہ کے ساتھ شاہی بدرقہ بھی اس راستہ میں ہوتا ہے۔ (۱۲ ص۱۹۰)

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دریا کا یہ مقام کتنا گہرا ہوگا جس میں سمندروں سے بچ کر نکل آنیوالے جہاز ڈوب جاتے تھے لیکن ایک مسلمان خاتون "زبیدہ" ہارون رشید کی بیوی کی نسبت لکھا ہے کہ:-

"زبیدہ نے اس گرداب کو پہلے کشتیوں کے ذریعہ سے قابو میں لانے کا حکم دیا اور آخر میں مسلسل پتھر کی چٹانوں کو ڈال ڈال کر اُسکو بھروا دیا۔ اور اب بحری سفر کے مسافر اس گرداب کی آفت سے محفوظ ہو گئے" (ابن حوقل صفحہ ۱۶)

المقدسی بحر ہند اور بحر عرب کے اہم مقامات اور اُن سمندروں کے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے اسکی بھی شہادت ادا کرتا ہے کہ:-

ولا بد ـــ فی	یعنی ہر ہر جہاز میں جنگی سپاہیوں کا
کل مرکب من	اور ان لوگوں کے ایک گروہ کا ہونا
مقاتلة ونفاطين	ضروری ہے جو نفط (پٹرول) کے ذریعے
(صفحہ ۱۳۰)	دشمن پر آگ پھینکتے ہیں۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحری قزاقوں اور ڈاکوؤں سے بھی حفاظت کا سامان حکومت کی جانب سے لازمی طور پر ہر جہاز میں کیا جاتا تھا۔ ان ہی سیاحوں نے مختلف شہروں کے ذکر میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ عموماً ان کے بازار کی سڑکیں پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ گرم سیر ممالک میں بازاروں کو مسقف کرنے کا بھی رواج عام تھا۔ (ابن حوقل صفحہ ۲۴۹)

بہر حال برّی اور بحری اور آبادی کے اندر کے راستوں کے متعلق خدمات

کے جو چند معمولی نمونے بطور مثال کے میں نے پیش کردیئے ہیں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے عہد میں رعایا کے آرام و آسائش کا اسلامی حکومتوں کو کتنا خیال تھا۔ قیاس کرنے کیلئے اتنا اجمال کافی ہے۔ ورنہ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ تو ایک بڑی داستان کا موضوع بن سکتا ہے۔ اس سلسلے میں جی چاہتا ہے کہ اس چیز کا بھی یہاں ذکر کردیا جائے جس کا ذکر عموماً جغرافیہ کی کتابوں کے ان مصنفین نے کیا ہے۔

سرحدوں کی فوجی چھاؤنیاں

رباط کا لفظ جسے بعد کے لوگوں نے سرائے اور مسافرخانوں کے معنے میں استعمال کرنا شروع کیا اور اس وقت بھی مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کی عام سرائیں جن میں ہر سال حجاج جاکر اترتے ہیں رباط ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن درحقیقت اسلامی عہد کا یہ ایک جہادی عنصر تھا۔ یعنی فتح کرتے ہوئے مسلمان زمین کے جس حصے تک پہونچکر رک جاتے تھے تو ٹھیک اپنے مفتوحات کی آخری سرحد پر جسے ثغور کہتے تھے۔ سرحدی چھاؤنیاں دشمن کے علاقے کو رخ پر رکھتے ہوئے مدافعت کیلئے بناتے تھے اور ان ہی سرحدی چھاؤنیوں کا نام رباط تھا۔ علاوہ ان لوگوں کے جو باضابطہ فوج میں بھرتی ہوتے تھے عام مسلمانوں کا مدت تک یہ ایک دلچسپ مشغلہ تھا کہ دنیاوی کاروبار میں کچھ دن صرف کرنے کے بعد رضاکارانہ طور پر وہ ان ہی رباطوں میں کسی رباط پر جہاد کی فضیلت حاصل کرنے کیلئے چلے جاتے تھے چونکہ

ان سرحدی چوکیوں پر دشمنوں سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ عموماً جاری ہی رہتا تھا اس لئے جہادی ولولوں کی تکمیل کا موقعہ لوگوں کو ملا کرتا تھا۔ بسا اوقات درجۂ شہادت پر لوگ اسی ذریعہ سے فائز ہوتے تھے۔ جو موت جیسی دشوار شئے کے حل کا مسلمانوں کو ایک نہایت ہی آسان نسخہ مل گیا تھا۔ بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ مثلاً عبداللہ بن مبارک، حضرت ابراہیم بن ادہم، اور بھی دوسرے بزرگوں کے حالات میں پڑھتے ہیں کہ سال کا کچھ حصہ ان سرحدی چوکیوں میں سے کسی چوکی پر یا اگر لڑائی کہیں ہوتی تو اسمیں شریک ہو کر فریضۂ جہاد کو ادا کرتے تھے، ابن مبارک کا تو کلی قاعدہ تھا کہ چار مہینے تجارت۔ چار مہینے درس۔ اور چار مہینے جہاد۔ بس پورا سال ان ہی تین حصوں پر منقسم تھا جس میں کبھی تخلف واقع نہیں ہوا۔

بہر حال ان رباطوں کا حال کیا تھا؟ ابن حوقل کی زبانی سنئے، منجملہ اور رباطی مقامات کے شام کی اس سرحدی سمت میں جو رومیوں کے ملک سے ملتی تھی ایک مشہور سرحدی چھاؤنی طرطوس نامی بھی تھی۔ ابن حوقل نے اسی کے تذکرہ میں یہ لکھتے ہوئے کہ:۔

"اس میں سوار اور پیادے کی ایک کافی تعداد ہمیشہ مقیم رہتی ہے اور اسلحہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اس میں مہیا رکھا جاتا ہے"۔

اس نے بیان کیا ہے کہ:۔

"معتبر لوگوں سے مجھے معلوم ہوا کہ اس رباط میں ایک لاکھ تو صرف سوار فوج رہتی تھی اور یہ زیادہ دن کی بات نہیں ہے خود میرے

بھی اس رباط کو اسی حال میں دیکھا ہے"۔

پھر آخر میں اس نے لکھا ہے کہ:۔

"واقعہ یہ ہے کہ سجستان وکرمان۔ فارس۔ خوزستان۔ جبال۔ طبرستان۔ الجزیرۃ آذربائیجان۔ عراق۔ حجاز۔ یمن۔ شامات اور مصر وعرب وغیرہ ان سارے ممالک کے سرحدی مقامات میں بڑے بڑے مکان اور عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ جن میں اس علاقے کے مجاہدین فروکش ہوتے ہیں۔ اور مرابطہ (اسلامی حدود کی حفاظت) کے فرض کو انجام دیتے ہیں"۔

اس کا بیان ہے کہ:۔

"ان سرحدی چوکیوں میں رہنے والے مجاہدین کے ساتھ لوگ بڑی فیاضی کا سلوک اور دل کھول کر داد و دہش کرتے ہیں حکومتوں کی طرف سے بھی اور عام اربابِ ثروت ودولت کی طرف سے بھی بڑی بڑی بیش قرار رقمیں اور مختلف قسم کی چیزیں مسلسل آتی رہتی تھیں۔ مسلمان ان میں رہ کر رضاکارانہ طور پر اس اسلامی فرض کو پورا کرتے تھے۔ میں نے جن جن علاقوں کا ذکر کیا ہے ان میں کوئی قابلِ ذکر رئیس یا بڑا آدمی ایسا نہیں پایا جاتا ہے جس کی طرف سے ان رباطی مقامات پر بڑے بڑے زرخیز دیہات اور شہروں کی دکانیں وقف نہ ہوں"۔

(ابنِ حوقل ص۱۴۳)

دوسری جگہ اسی ابن حوقل نے مغربِ اقصیٰ کے آخری حدود کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

وادی فاس کے آگے برغواطہ نامی شہر ہے۔ یہاں سے ڈاک کی چوکی سے ایک منزل کے قریب فاصلہ پر سلا کی وادی ہے۔ اور یہی وہ وادی ہے جہاں پر مسلمانوں کے علاقہ کی آخری حد ہے۔"

اس کے بعد آخری حد کی رباط یا سرحدی چوکی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:-

"اس علاقہ کا یہی مقام یہاں کی رباط ہے۔ جس میں مسلمان مرابطہ (اسلامی حدود کی حفاظت) کا فرض اسی میں مقیم ہو کر انجام دیتے ہیں۔ اسی وادی کے ساحل پر سلا کا پرانا شہر تھا۔ جو ان دنوں صرف کھنڈر بن کر رہ گیا ہے۔ اسی کھنڈر کے چاروں طرف مسلمانوں کی چھاؤنیاں ہیں۔"

آخر میں بیان کرتا ہے کہ:-

"بسا اوقات اس سرحدی چوکی میں ایک ایک لاکھ آدمی بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کبھی بڑھ بھی جاتے ہیں۔ اور کبھی گھٹ بھی جاتے ہیں۔" (ابن حوقل ص۵۶)

اور یہی حال اس نے مسلمانوں کے آخری مشرقی حدود کا۔ اس زمانے کا بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے:-

"ماوراء النہر کے تمام سرحدی علاقے جو دار الحرب سے ملے ہوئے ہیں (اور خوارزم سے شروع ہو کر اسبیجاب تک) ان کا جو سلسلہ

چلا گیا ہے۔ یہ تو غزی ترکوں (جو اس زمانہ تک مشرف باسلام نہ ہوئے تھے) کے مقابلہ کی سرحدی چوکی ہے اور اسیجاب سے فرغانہ تک خزلجی کافر قبائل کے مقابلہ کے ثغور ہیں؛

آخر میں لکھتا ہے کہ:-

مسلمان ہمیشہ ان غیر مسلم اقوام کو روکے اور دبائے رکھتے ہیں جو اس علاقے میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ اسلام کے مقابلے میں کوئی دارالحرب (یعنی کافروں کا علاقہ) ترک کے اس علاقہ سے زیادہ سخت نہیں ہے۔ پس یہی مسلمان ان ترکوں کے مقابلہ میں سرحد کی حفاظت کا کام کرتے ہیں اور دارالاسلام کی طرف چڑھ دوڑنے سے ان کو روکے رہتے ہیں۔ یہ جتنی ماوراء النہر کی سرحدی چوکیاں ہیں۔ ہمیشہ غزا اور جہاد ہی میں مصروف رہتی ہیں۔ دشمن کے مقابلہ میں جنگ کا جب اعلان ہوتا ہے تو یہ بات عام طور پر سمجھی جاتی ہے اور شہرت رکھتی ہے کہ نصر بن احمد کے زمانے میں جو اندازہ کیا گیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ تین لاکھ جنگ جو افراد یہاں سے اکٹھے کئے جا سکتے ہیں"۔ (ابن حوقل)[۲۴۰]

بہر حال ان چند بیانات سے مسلمانوں کی مرابطت اور رباط کے نظم کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حکومت کی جانب سے ان علاقوں میں مکانات کا ایک طویل سلسلہ بطور بیرکس کے بنا ہوا رہتا تھا۔ ان عمارتوں کی نوعیت کیا ہوتی تھی؟ اس کا پتہ اصطخری کے اس بیان سے چل سکتا ہے جو اس نے ہاردینہ نامی سرحدی چوکی

کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

"اردنیہ شام کا ایک شہر ہے۔ دراصل یہ فوجی چھاؤنی ہے یہاں پر عرافہ کے لئے دو دو کمرے اس طور پر بنے ہوتے ہیں کہ ہر کمرہ میں دو دو منزلیں ہوتی ہیں۔ ایک بالائی اور ایک نشیبی"۔

پھر عرافہ کی تشریح اس نے خود یہ کی ہے کہ:-

"دس سے پندرہ آدمیوں کی ٹولی عرافہ کہلاتی ہے" (الہمدانی ص۱۲۴)

جس سے معلوم ہوا کہ دس سے لے کر پندرہ سپاہیوں کی کمپنی کے لئے اس قسم کی دو منزلہ بیرکیں ان چھاؤنیوں میں عموماً بنی ہوئی تھیں۔ گویا ایک عرافہ کے قبضہ میں نیچے اور اوپر کی منزلوں کو ملا کر چار چار کمرے ہوا کرتے تھے۔

رہا ان چھاؤنیوں کا محل وقوع۔ سو اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے جو ابن حوقل نے شام ہی کی مشہور سرحدی چھاؤنی مصیصہ کے متعلق لکھا ہے، یہ بھی رومیوں کی مدافعت کے لئے بنائی گئی تھی۔ کسی زمانہ میں اسے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بڑے بڑے محدثین اور علماء اس چھاؤنی کے رہنے والے سپاہیوں کی تربیت و تعلیم کیلئے یہاں رہتے تھے۔ جن کا اسلامی تاریخوں میں بکثرت ذکر آتا ہے۔ بہرحال ابن حوقل اسی مصیصہ کے متعلق لکھتا ہے کہ:-

"مصیصہ دراصل دو شہروں کا مجموعہ ہے ایک کا نام تو دراصل مصیصہ ہی ہے۔ اور دوسرے کو کفر بیا کہتے ہیں۔ جیحان دریا (یہ شام کا دریا ہے۔ ماوراء النہر والے جیحون سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے) کے دونوں کناروں پر یہ دونوں چھاؤنیاں

آباد ہیں۔ دونوں کو ایک سنگین پل کے ذریعے سے متصل کر دیا گیا ہے۔ دونوں کی دونوں بڑی مستحکم اور مضبوط ہیں۔ محل وقوع ان کا ایک بلند قطعۂ اراضی ہے۔ جامع مسجد میں بیٹھ کر آدمی جب سامنے سمندر کی طرف دیکھتا ہے تو قریب بارہ میل تک نظر سمندر کی سطح پر پھیل جاتی ہے گویا ایک خنک بخش تر و تازہ نظارہ اس کے سامنے جلوہ پرواز ہوتا ہے[1]" (ابن حوقل ص۲۲۱)

---

[1] ابن حوقل کے اس بیان کو پڑھ کر بے ساختہ سلطان عالمگیر اورنگ زیب کے پوتے شاہزادہ عظیم الشان کا بسایا ہوا شہر مرحوم "عظیم آباد" یاد آ گیا۔ جو خود تو اپنی ویرانی کی داستان اپنے کھنڈروں کی زبانی کہہ رہا ہے۔ لیکن بجانب مغرب کچھ دور ہٹ کر انگریزوں کے عہد کی آبادی بنام بانکی پور اور اس سے بھی آگے خود انگریزوں کی سول آبادی "بنام نیو پٹنہ" آباد ہو گئی ہے۔ اس مرحوم عظیم آباد کی وہ جامع مسجد جو خود تو دست و برد زمانہ سے ایک حد تک اب تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ لیکن چاروں طرف اس کے صرف ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے آثار دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مسجد کافی وسیع اور خوبصورت بنی ہوئی ہے محل وقوع اس مسجد کا بھی ٹھیک منصورہ کی جامع مسجد کے مشابہ ہے۔ بالکل لبِ گنگا ایک بلند ٹیلے پر تعمیر کی گئی تھی۔ گنگا کا پاٹ وہاں پر دو ڈھائی میل سے کم ہرگز نہ ہوگا۔ مسجد کی دیواروں سے گویا لپٹ کر گنگا کے شفاف۔ رواں پانی کی موجیں ٹکراتی رہتی ہیں۔ مسجد میں کھڑے ہو کر میلوں دُور تک پانی ہی پانی کا وہ نظارہ کتنا جاں بخش اور روح پرور ہو سکتا ہے۔ لیکن جب کبھی اس مسجد میں جانے کا اتفاق ہوا۔ خصوصاً تنہائی میں تو بجائے سرور کے آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب

(باقی اگلے صفحہ پر)

مسلمانوں کا علمی شغف اور امراء کی فیاضیاں

مسجد کے ذکر کے سلسلے میں ابن حوقل کی بعض ان باتوں کا خیال آتا ہے جو اس زمانہ میں مسلمانوں کی مسجدوں کی خصوصیت تھی۔ اس نے ہراۃ کی جامع مسجد کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بیان کرتے ہیں کہ:-

---

ہی جاری ہوا۔ تخیل اپنے سامنے اضطراراً اس عہد کو لا کر کھڑا کر دیتا تھا جبکہ نمازیوں سے بھری ہوئی ہے اور اطراف کے حجرے جن سے متعلق معلوم ہوا کہ طلباء کے حجرے تھے طلباء ان میں آباد ہیں، مدرسین جس وقت اس مسجد کے صحن اور برآمدے میں بیٹھ کر سامنے گنگا کی موجوں کے رقص کا تماشا کرتے ہوئے سینکڑوں درس ہوں گے تو وہ کیا دن ہوں گے۔ پٹنہ کے گورنر کی سواری جمعہ کے دن جب اسی مسجد میں آتی ہوگی، کیا شان اور کیا شکوہ ہوگا۔ تخیل اس تماشے کو سامنے لاتا تھا اور آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ پوری مسجد یہاں سے وہاں تک خالی ہے۔ نمازوں کے اوقات میں بھی بجز چند ٹوٹے پھوٹے گرے پڑے غریب مسلمان بازاری بوڑھوں کے کوئی جھانکنے کیلئے بھی نہیں آتا۔ علماء کہاں گئے؟ طلباء کیا ہوئے؟ مغل حکومت کے گورنر کہاں ہیں؟ شاہی سطوت و صولت کدھر گئی؟ کلیجہ اگر پھٹ نہ جائے تو آپ ہی بتلایئے کہ اور کیا ہو۔ ہند کا چپہ چپہ ان جگر خراش نظاروں سے معمور ہے۔ اب ہمارے لئے اس ملک میں مرثیہ ہی باقی رہ گیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون ان الارض للہ یورثہا من یشاء ولا ینال عہدی الظالمین۔ ۱۲

"یہاں کی جامع مسجد بیچ شہر میں واقع ہے۔ جس کے چاروں طرف بازار ہے، اور قید خانے کی عمارت جامع مسجد کے قبلہ کی دیوار کی پشت پر ہے۔"

اس مسجد کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"میں نے ماوراء النہر اور جبال کے ان تمام علاقوں میں اس جامع مسجد سے زیادہ آباد کسی مقام کی جامع مسجد نہیں دیکھی۔ شبانہ روز لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ اس میں جاری رہتا ہے اور یہی حال میں نے بلخ کی جامع مسجد کا بھی دیکھا ہے اور قریب قریب یہی کیفیت سجستان کی جامع مسجد کی بھی ہے۔"

لیکن یہ آبادی اور گہما گہمی جس کا نظارہ ان مساجد میں ابن حوقل نے کیا، کن لوگوں سے تھی؟ اسی کا بیان ہے کہ:۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ان مسجدوں میں ایک بڑا گروہ علماء اور فقہاء کا مقیم ہے اور جیسے شام یا مسلمانوں کی سرحدی چوکیوں کی مسجدوں کا حال ہے وہی حال ان کا بھی ہے۔ یعنی ان علماء سے استفادہ کرنے والوں کی حالت یہ ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔" (ص ۳۲۵)۔

اور یہ بھی اس زمانہ کا حال تھا کہ مسلمانوں کی یہی مسجدیں دراصل مدرسے کا کام دیتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں ابن حوقل ان علاقوں میں آیا ہے اس وقت تعلیمی اور تدریسی حیثیت سے مشرق میں ہراۃ اور بلخ کو بہت اہمیت

حاصل ہو گئی تھی۔ جیسے مغربی اور اسلامی ممالک کے وسطانی علاقوں کی مسجدیں بڑی بڑی تعلیم گاہوں کی شکل اختیار کئے ہوئے تھیں۔

"بلخ کے تذکرے میں بھی اس نے پھر اسی بیان کو دہراتے ہوئے لکھا ہے

"بلخ بھی مسلمانوں کا ایک بہت بڑا شہر ہے۔ مرو اور ہرات کی طرح اسکی آبادی بھی گھنی ہے۔ ایک کشادہ اور مسطح میدان اس شہر کا محل وقوع ہے کوئی پہاڑ بھی اس کے قریب نہیں ہے۔ قریب ترین پہاڑ کا فاصلہ قریب قریب بارہ میل سے کم نہیں ہے جامع مسجد اسکی بھی ٹھیک بیچ شہر میں واقع ہے اور بازار کی دکانیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یعنی جامع مسجد کے اطراف کو ان دکانوں نے گھیر رکھا ہے اور صبح و شام ہر وقت ہر گھڑی لوگوں کی آمد و رفت کا تانتا اس مسجد میں بندھا رہتا ہے۔ اسی کی ایک نہر ہے جسکا نام دہ آس ہے۔ یعنی دس پن چکیوں والی نہر۔ یہ نہر نوبہار[1] کے قریب سے گذرتی ہے اور سیاہ جرد نامی قصبہ تک دوسرے قصبوں کو سیراب کرتی چلی جاتی ہے۔ بلخ کے تمام دروازوں کے باہر جہاں تک دیکھو بساتین باغات اور تاکستان ہی تاکستان نظر آئیں گے، اس شہر کی شہر پناہ بھی مٹی کی ہے۔"

---

[1] جامع مسجد کے قریب نوبہار کا ذکر اس شہر کے لوگوں کے خصوصی علمی ذوق میں ممکن ہے کہ اس نوبہار کو بھی دخل ہو۔ دراصل یہ وہی لفظ ہے جسکا اصلی لفظ وہار ہے (باقی آگے)

آخر میں لکھتا ہے کہ :-

"اس شہر کے باشندوں پر عموماً علم و ادب کا ذوق غالب ہے۔ غور و فکر

وہاں پہلا بودھ مت کے مدارس کہئے یا خانقاہوں کا ہندی نام تھا۔ زمانہ نے کثرتِ تلفظ سے بہار کی شکل اختیار کر لی جیسے بید دید کو دریا کو ددّیا لوگ عموماً کہتے ہیں۔ ہندوستان خصوصاً بہار میں بودھ والوں کے ان بہاروں یا وہاروں کی تو اتنی کثرت تھی کہ آخر ایک پورا صوبہ ہی بہار کے نام سے موسوم ہو گیا۔ خود بخارا لفظ بھی وہارا ہی کے لفظ کی ایک شکل ہے سرحد میں اب بھی ح کا لفظ لوگ خ سے کرتے ہیں۔ یہ سارا علاقہ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ بودھ مت کا پابند تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلخ کا وہار جسے آخری احد نیا وہار کہتا اسی لئے نو بہار کے نام سے موسوم ہے۔ اس نو بہار کے تفصیلی حالات ہماری کتابوں میں لکھے ہیں۔ یہاں مہاتما بدھ کی بہت بڑی بڑی عظیم القدر کی دو مورتیاں ہیں جن میں ایک کا سرخ اور ایک کا سیاہ رنگ ہے۔ ہندوستانی علوم کا رشتہ عربی زبان سے جو ملا۔ اس میں سچ پوچھئے تو بلخ کے اسی نو بہار کا ہاتھ شریک ہے۔ اسی نو بہار کا افسر اعلیٰ جسے برمک کہتے تھے یعنی بڑا مونک جو بودھ مذہب کے علماء و مشائخ کا خطاب ہے۔ اس کا بڑا مونک برمک کے نام سے موسوم تھا۔ الہمدانی نے اس کا طویل قصہ لکھا ہے کہ اس نے کشمیر میں طب اور نجوم فلسفہ وغیرہ ہندوستانی علوم کی تعلیم حاصل کی تھی۔ یہی مسلمان ہو کر عباسی دربار میں داخل ہوا اور بتدریج اسکے خاندان والوں نے وہ عظمت و جلالت حاصل کی جس کے ذکر سے اسلامی تاریخ کی کتابیں معمور ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کشمیر میں تعلیم پانے ہی کا اثر تھا کہ جب بغداد میں بیت الحکمت قائم ہوا تو یونانی علوم کے ساتھ ہندی علوم و فنون کے ترجمہ کی سفارش برامکہ والوں نے کی۔ نیز ان کے قدیم مذہب کا بھی تعلق ہندوستان ہی سے تھا۔ ۱۲۔ (الہمدانی صفحہ ۳۲۲)

اور دقیق علوم کے مسائل سے انہیں بڑی دلچسپی ہے۔ یہاں سے بڑے بڑے علما راٹھے ہیں۔ (ابن حوقل ص ۲۳۶)

اور یہ واقعہ ہے خصوصاً ابتدائے اسلام کے بعض جلیل القدر اکابر صوفیہ بلخ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم بن ادھم و شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہم

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مسلمانوں نے چونکہ مسجدوں خصوصاً ہر شہر کی جامع مسجد ہی کو مدرسہ بنا رکھا تھا یہی وجہ ہے اس بات کی کہ تعلیم کی اس عام اشاعت کے باوجود ابن حوقل وغیرہ جیسے محتاط مورخین کی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم والعہدۃ علی الراوی۔ یعنی خوزستان کے شہروں سے جب وہ گذر رہا تھا۔ (تستر، جندیسابور، اہواز وغیرہ جس علاقہ میں واقع ہیں) وہ لکھتا ہے۔ میں بجنسہٖ اسکے الفاظ کا ترجمہ کیساتھ نقل کر دیتا ہوں،

ولقد رأیت حمالاً عبر	میں نے ایک حمال (قلی) کو گزرتے ہوئے دیکھا
وعلیٰ راسہٗ وقر ثقیل	کہ اسکے سر پر یا پیٹھ پر بھاری بوجھ لدا ہوا تھا
او علیٰ ظہرہٖ وھو	اور ایک دوسرا حمال بھی اسی کے ساتھ ساتھ
یسائر حمالاً آخر	جا رہا تھا۔ اور دونوں التاویل (یعنی
علیٰ حالہ وھما یتنازعان	قرآنی آیات کی تفسیر اور علم کلام کے دقیق
فی التاویل وحقائق	ومسائل پر جھگڑتے جا رہے تھے، ایسا معلوم
الکلام غیر مکترثین	ہو رہا تھا کہ ان دونوں پر جو بوجھ لدے
بما علیھما فی جنب	ہوئے تھے اپنے خیالات کے مقابلہ میں
ما خطر لھما	ان کی کوئی پروا ان کو نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یورپ اور امریکہ میں بھی آج تعلیم عام ہے لیکن عام تعلیم کا معیار ان ممالک میں کیا اس سے زیادہ ہے کہ مادری زبان کے حروف کی لکیروں سے وہ آشنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اتنی دماغی تربیت تلیوں تک کی کہ تفسیر اور کلام کے مسائل و مباحث پر وہ اتنے انہماک سے گفتگو کرنے میں مشغول ہوں کہ سر کے بوجھ کی خبر بھی انہیں باقی نہ رہتی ہو۔ میں نہیں جانتا کہ مغرب کی عام حالت آج بھی ان نتائج کو پیش کر سکتی ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ عروج و اقبال میں علم کی قدر و منزلت میں جو خدمات انجام دی ہیں اس وقت تک دنیا کی قومیں ان کی نظیر مشکل ہی سے پیش کر سکتی ہیں۔ حکومت اور سلطنت کے سوا عام مسلمانوں میں علم و فضل کا جو احترام تھا۔ اگر ان واقعات کو کوئی جمع کرنا چاہے تو ایک کتاب بن سکتی ہے جاحظ جو تیسری صدی ہجری کا ایک منشی اور ادیب ہے خود اس کا بیان ہے کہ:۔

"میں نے کتاب "الحیوان" لکھ کر عبد الملک الزیات کی خدمت میں ہدیہ کی تو اس کے صلہ میں پانچہزار اشرفیاں اس نے مجھے بھیجیں پھر میں نے اپنی کتاب "البیان والتبیین" احمد بن ابی داؤد کے دربار میں پیش کی۔ اس نے بھی اسی وقت پانچہزار اشرفی سے میری ہمت افزائی کی۔ پھر کتاب "الزرع والنخل" لکھ کر میں نے ابراہیم بن عباس الصولی کے پاس بھیجی۔ جواب میں نے اس نے بھی پانچہزار اشرفیاں روانہ کیں۔"

(الجاحظ صـ۲۴)

اور سچ تو یہ ہے کہ علم والوں کو جس قوم نے سونے اور چاندی سے تول تول کر رکھدیا ہو، ادبا کی ہمت افزائیوں کے سلسلہ میں یہ واقعہ کرکے دکھادیا ہو کہ ان کے منہ موتیوں سے بھر دیے گئے۔ تیمور جیسا آتشیں مزاج آدمی جس نے محض خلافِ شان ایک فقرے سے ترکی بادشاہ یلدرم کے ملک پر حملہ کردیا تھا اور یلدرم کو قفسِ آہنی میں بند کرنے کا جو عہد کیا تھا اسے پورا کرکے رہا ہو۔ اس کا سارا غصہ علم کے مقابلہ میں اس طرح ٹھنڈا ہو کر رہ جاتا ہے کہ گویا اس کے مزاج میں کبھی غصہ تھا ہی نہیں۔ کیا دنیا کی کسی گذشتہ یا موجودہ قوموں میں علمی عظمتوں کی ان مثالوں کو تلاش کرسکتے ہیں اور تلاش بھی کریں تو اپنی اس کوشش میں آپ کامیاب ہوسکتے ہیں؟ اس مسئلہ پر اردو زبان میں لکھنے والوں نے کافی مواد جمع کردیا ہے۔ مسلمانوں کے زمانے میں علما اور طلبا کے ساتھ نہ صرف حکومت بلکہ عام پبلک کا جو سلوک تھا۔ میں نہیں جانتا کہ آسمان نے اس کے تماشے کبھی کہیں اور بھی دیکھے ہوں گے۔ یورپ جسے اپنی تعلیمی قدر شناسیوں پر آج بہت ناز ہے لیکن زیادہ دن کی بات نہیں ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخری سالوں کا واقعہ ہے بلکہ صاحبِ واقعہ تو بیسویں صدی تک زندہ رہا۔ میری مراد ومبری سے ہے جس نے رشید آفندی کے نام سے اسلامی ممالک خصوصاً وسط ایشیا۔ ترکستان بخارا۔ خیوہ کا سفر بعض باطنی اغراض کے تحت کیا تھا اور اسلام دشمنی میں خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ ہمیشہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے کی تحقیر و توہین اسکا عام شیوہ ہے۔ لندن میں مسلمان قاریوں کے لہجہ کی نقل بنا بنا کر وہاں کی سوسائیٹیوں کا گویا مسخرہ بنا ہوا تھا۔ متعدد

زبانوں خصوصاً عربی، فارسی، ترکی کا ماہر تھا۔ اس نے وسط ایشیا والے سفرنامے میں خود اپنی ابتدائی تعلیمی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"ابتدا میں ہنگری کے مدرسہ سینٹ جارج میں جو پیٹرس برگ کے قریب تھا داخل ہوا۔ رات کا کھانا مجھے سات مختلف کنبے ہفتہ میں دیا کرتے تھے۔ ہر روز ایک کنبہ کے ہاں رات کا کھانا کھانا تھا۔ اور جب کھا چکتا تھا تو وہ مجھے ایک روٹی صبح کے ناشتہ کیلئے بھی دے دیتے تھے اور اس مدرسہ میں جو امیر طالب العلم تھے اُن کے اُتارے ہوئے کپڑے بھی مجھے مل جاتے تھے۔" ص ۸

اگرچہ یہ ایک شخصی زندگی کا شخصی حال ہے لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یورپ کے عام باشندوں کا طلبۂ علم کے ساتھ انیسویں صدی کے اخیر تک کیا برتاؤ تھا۔ ایک طالب علم کو بھی دونوں وقت کھانا دینے کی ہمت وہاں کے لوگوں کو نہیں ہوئی تھی۔ سات کنبوں نے وہ بھی صرف رات کے کھانے کی ہفتہ میں ایک ایک دن کی ذمہ داری لی تھی۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں اب آپ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ پڑھ جائیے، شمال میں، جنوب میں، مشرق میں، مغرب میں، جہاں کہیں وہ تھے، طلبۂ علم کو کس طرح ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے خود ہندوستان کا حال اس معاملہ میں آج سے کچھ دن پہلے کیا تھا۔ اس کی تفصیل آپ کو میری کتاب "مسلمانانِ ہند کے نظامِ تعلیم و تربیت" میں مل سکتی ہے۔

البتہ اینٹ اور چونے کے ساتھ تعلیم جیسی عام اور آزاد شے کو مقید کرنا مسلمان اسکو غیر ضروری سمجھتے تھے اور یہی چیز لوگوں کیلئے باعث غلط فہمی بنی ہوئی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ مدرسوں کی عمارتوں کی جگہ مسلمانوں میں مسجدوں کا تو جال پھیلا ہوا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ بہت دن بعد نہیں۔ بلکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی کل ۱۵ سال کے اندر اندر چار ہزار مسجدیں ممالک اسلامیہ میں تعمیر ہو چکی تھیں۔ صرف ایک شہر قرطبہ میں تین ہزار آٹھ سو تہتر (۳۸۷۳) مسجدیں تھیں اور صرف قرطبہ کا یہ حال ہے تو تعداد کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ اور کیسی مسجدیں؟ گذر چکا کہ صرف ایک کوفہ کی مسجد میں کم و بیش چالیس ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی۔ وہی ولید والی جامع اموی جس کے معماروں پر ہزار کی سبزی اور ترکاریاں خرچ ہوتی تھیں۔ الہمدانی نے لکھا ہے کہ:-

انہ فی جامع الاموی مقعد عشرین الف رجل (الہمدانی ص۔۔)

جامع اموی میں بیس ہزار آدمیوں کی نشستگاہ ہے

اور یہی حال فسطاط مصر کی جامع عمرو بن عاص کا تھا۔

قرطبہ کی مسجد کا طول و عرض آخر میں جس نوبت پر پہنچ کر رہا تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۲۹۳ ستونوں پر یہ مسجد کھڑی تھی اور ان ستونوں سے جو بیچ بیچ میں قبے بن گئے تھے جنہیں اس زمانہ میں ثریا کہتے تھے انکی تعداد ۲۸۰ تھی۔ گویا یہ ۲۸۰ درسگاہیں تھیں۔ کیا اتنی بڑی بڑی عمارتیں جو صرف نماز کے وقتوں میں نماز کے کام آتی تھیں ان کے رہ جانے

مسلمانوں کو مدرسوں کے لئے علیحدہ عمارتوں کے بنانے کی ضرورت باقی بھی رہی تھی؟ مگر انہوں نے یہ واقعہ ہے کہ باوجود غیر ضروری ہونے کے مدارس بھی بنوائے جنکے حالات سے آپ لوگ کافی طور پر واقف ہو چکے ہیں۔

اُس زمانے کے لباس اور کھانے پینے کی تفصیلات

اپنے ابتدائی تخمینے سے اب یہ عجالہ کافی متجاوز ہو چکا ہے۔ تاہم چند چیزوں کا ذکر اور سُن لیجئے!

ابن حوقل اور اسی صنف کے دوسرے مورخین نے دوسرے اُمور کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں اُس زمانے کے لباس اور انکے کھانے پینے کی خصوصیتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کا نقطۂ نظر اس باب میں باوجود مذہب اور دین ہونے کے کچھ مسامحت ہی کا تھا۔ بلکہ لوگوں کو جلیا کہ معلوم ہے قرآن ہی میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ طیبات من الرزق یعنی صاف ستھری پاک وخوشگوار غذاؤں اور خدا نے جن چیزوں کو اپنے بندوں کے تجمل اور زیب وزینت کیلئے پیدا کیا ہے ان کو حرام ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ سمجھا جائے کہ ان چیزوں سے احترازکی روش اختیار کرنیوالوں کی قرآن نے سرزنش کی ہے تو پیا سکے کھلے کھلے نصوص کا اقتضار ہے۔

بہر حال یہ ایک الگ مستقل حقیقت ہے۔ میری کتاب "اسلامی معاشیات" میں اسلام کے تفصیلی نقطۂ نظر کو آپ پڑھ سکتے ہیں۔ اس وقت میری گفتگو کا تعلق اصول سے نہیں بلکہ واقعات سے ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خلافت نے جب سے بجائے خلافت کے "ملوکیت" کی شکل اختیار کی اسوقت سے مسلمان سلاطین اور بادشاہوں کا بتدریج حدود سے گزر کر تکلفات کی طرف قدم بڑھتا چلا گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں کیلئے ان چیزوں کا ذکر ندامت اور شرمندگی ہی کے جذبات کو متحرک کرتا ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ:۔

اول من تنعم فی ماکله و مشربه وملبسه معاویةؓ (الدمیری ص؟)

مسلمانوں میں سب سے پہلے جن صاحب نے کھانے پینے لباس وغیرہ میں تکلف کی ابتدا کی وہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

اور اس سلسلہ میں محاضرات و مسامرات کی کتابوں میں امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق دلچسپ حکایتیں نقل کی جاتی ہیں۔ بلکہ لکھنے والوں نے تو یہاں تک لکھدیا ہے کہ بنی امیہ کے توشک خانے سے لباس کا جو ذخیرہ برآمد ہوا تھا اس میں حضرت معاویہؓ کے کپڑے اپنی روغنی آستینوں ہی کی علامت سے پہچانے جاتے تھے۔ اگرچہ ابنِ اثیر نے اسی کھانے پینے کے قصے میں امیر معاویہؓ کا یہ لطیفہ بھی نقل کیا ہے کہ:۔

"عبید اللہ بن ابی بکرؓ معاویہؓ کے دستر خوان پر ایک دن اپنے صاحبزادے کیساتھ کھانے کیلئے بیٹھے۔ عبید اللہ کے یہ صاحبزادے کچھ پُر خور تھے، بار بار معاویہؓ کی نظر اس بچے پر پڑ رہی تھی۔ عبید اللہ نے اسکو بھانپ لیا۔ دوسری دفعہ جب کھانے کے لئے عبید اللہ مدعو ہوئے تو اب کے وہ تنہا بیٹھے۔ امیر معاویہؓ نے دریافت

کیا کہ:-

ما فعل ابنک ا لتقامہ تمہارا تلقامہ[1] بیٹا کیا ہوا جو آج نہیں آیا؟

اسکے جواب میں عبید اللہ نے کہا کہ "بیمار ہو گیا ہے" امیر معاویہ رض نے سنکر فرمایا کہ میں تو پہلے ہی سمجھے ہوئے تھا کہ اس کے کھانے کا جو انداز ہے ضرور کسی بیماری کو دعوت دے گا" (کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بذات خود امیر معاویہ رض کا طرزِ عمل اس بات میں کچھ بھی رہا ہو لیکن اصولی طور پر "پرخوری" کو وہ کبھی پسند نہیں فرماتے تھے۔

لیکن دولت جن لوازم کے ساتھ آئی ہے ان سے مسلمان کیسے بچ سکتے تھے عوام کے متعلق تو نہیں کہتا لیکن ارباب حکومت کی بے احتیاطیاں جو آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی تھیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں کھانے کی کیفیت کے کمیت میں لوگوں نے مبالغہ شروع کیا۔ خود حجاج کے متعلق ابن عساکر نے یہ نقل کیا ہے کہ "ایک ایک نشست میں وہ اسی اسی روٹیاں اور ہر روٹی میں ایک کف دست مکھن بھر بھر کر نگل جاتا تھا اور بھی اس کے پرخوری کے قصے کتابوں میں منقول ہیں۔

مشہور ہے کہ اپنے طبیب تیاذوق نامی سے حجاج نے ایک دفعہ ضعف معدہ کی شکایت کی اُنہوں نے ہدایت کی کہ بھنے ہوئے پستے استعمال کیجئے۔ یہ سنکر اپنے ارباب حاشیہ سے حجاج نے ذکر کیا کہ بھنے ہوئے پستوں کا مشورہ آج تیاذوق نے مجھے دیا ہے خوشامدیوں کے مختلف گھروں سے بھنے ہوئے پستوں کی سینیوں پر سینیاں

---

[1] تلقامہ بسیار خور کا صیغہ ہے لقمہ اس کا مادہ ہے بہت کھانے والا آدمی اس سے مراد ہے ۱۲

تھوڑی دیر کے بعد ہی نازل ہونے لگیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ طبیب نے حکم دیا ہے، مٹھیوں میں بھر بھر کر حجاج لیتے پھانکنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قریب قریب ہیضہ کی شکل اس نے اختیار کر لی۔ بڑی مشکل سے جان بچی۔ (عیون الانباء ص ۱۲۲/۱۲)

بنی امیہ کے گورنروں میں ابن ہبیرہ مشہور "تلقاموں" میں تھا۔ وہی ابن ہبیرہ جسنے حضرت امام ابوحنیفہؒ کو تازیانوں سے پیٹا تھا۔ لکھا ہے کہ:۔

"صبح ہونیکے ساتھ پہلا کام ابن ہبیرہ کا حاجات ضروری اور نماز وغیرہ سے فارغ ہونیکے بعد یہ تھا کہ دودھ کا ایک بڑا پیالہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ شہد یا شکر کو پیالے میں رکھکر دودھ کو اسی پر دوہتے تھے۔ اور اسی تازہ تازہ دودھ کے "قدح کبیر" کو وہ چڑھا جاتا تھا۔ آفتاب جب نکلتا تب ناشتہ حاضر کیا جاتا تھا۔ یہ ناشتہ کیا تھا؟ دو تلی ہوئی مرغیاں، دو کبوتر کے بچے اور ایک حیوان کا نصف بھنا ہوا دھڑ اسکے سوا مزید برآں چند دوسرے قسم کے گوشت بھی ناشتے کے اس دسترخوان پر ہوتے تھے اور یہ سب کچھ ایک ابن ہبیرہ کا ذاتی ناشتہ تھا۔ اسکے بعد وہ دفتری کاروبار میں مشغول ہو جاتا تھا۔ دوپہر تک کام کرتا رہتا۔ اسکے بعد دفتر سے اٹھکر پھر آرام گاہ میں اپنی آتا۔ اور اب دوپہر کے کھانیکا دسترخوان چنا جاتا۔ اسوقت بھی بڑے بڑے لقمے اٹھاتا تھا کیونکہ دوپہر کے کھانے میں اسکے ساتھ دوسرے ارباب حکومت بھی شریک رہتے تھے۔ کھانے کے بعد اندر حرم میں چلا جاتا تھا ظہر کی نماز

کیلئے پھر برآمد ہوتا اور نماز کے بعد کاروبار میں مشغول ہوجاتا
عصر کی نماز پڑھکر بیٹھتا اُسوقت عام مجلس ہوتی تھی۔ خود تو
تخت پر بیٹھتا تھا اور گرد و پیش میں لوگ کرسیوں پر بیٹھتے۔ اسکے
بعد دودھ شہد آمیختہ اور دوسرے قسم کے مشروبات کا دور چلتا
اسی عرصے میں پھر دستر خوان بچھ جاتا جس پر کھانیوالوں کی ایک
بڑی تعداد بیٹھتی تھی۔ عوام کیلئے تو دستر خوان پر کھانے چنے
جاتے تھے اور خود ابن ہبیرہ اور اسکے مخصوص درباریوں کیلئے
خوان (یعنی چھوٹے چھوٹے پائے کی میز) رکھی جاتی ہے مغرب
کے وقت تک کھانے کا یہ قصہ ختم ہوتا تھا۔"[1]

باقی اُموی خلفاء میں سلیمان بن عبدالملک کی پُرخوری تو ایک عام مشہور بات ہے تقریباً ہر مورخ نے اس لطیفہ کو اسکے لکھا ہے کہ :-

"طائف موسم گرما بسر کرنے کیلئے ایک دفعہ گیا ہوا تھا۔ کسی
باغ میں پہنچا۔ ستر انار کھانے کے بعد مسلّم حلوان اور چھ مرغیاں
مسلّم بھُنی ہوئی سب کو چڑھا گیا۔ اس کے بعد طائف کی کشمش

---

[1] بنی امیہ اور انکی تقلید میں عباسی خلفاء کا ایک دوامی دستور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولاۃ حکام جس شہر میں رہتے تھے وہاں کے ممتاز باشندوں کو کم از کم ایک وقت وہ اپنے ساتھ کھانا ضرور کھلاتے تھے۔ اور حکومت کی طرف سے اس کا ان کو اشارہ تھا۔ اور خرچ ملتا تھا۔ کہ عوام کی ہمنوائی اور ہمدردی کے حاصل کرنے کا ایک کارگر ذریعہ اس کو وہ خیال کرتے تھے۔ ۱۲

مٹھیوں میں بھر بھر کر پھانکتا رہا۔ کچھ نیند آگئی۔ سو کر بیدار
ہوا اور حسبِ معمول دوپہر کے کھانے میں جو کچھ کھانا تھا سب
کھایا۔ کہتے ہیں کہ اسی میں بیچارے کی جان بھی گئی"۔
"رالبق سیر کیلئے گیا ہوا تھا۔ قریب میں کوئی نصرانی رہتا تھا
دو تھیلیاں تحفہ میں اس نے پیش کیں۔ ایک میں انجیر اور دوسری
میں اُبلے ہوئے انڈے تھے۔ دونوں تھیلیوں کو صاف کر کے
فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ گودا اور شکر پیش ہوئی۔ انکو بھی اپنی
زنبیل میں داخل کر دیا۔ اور اسی بھری ہوئی زنبیل کیساتھ
عالمِ آخرت کی راہ لی۔ تخمہ ہو گیا تھا"۔

مسعودی نے تو بطورِ ضرب المثل کے لکھا ہے کہ اموی دور میں امیر معاویہ علیہ اللہ
بن زیاد۔ حجاج اور سلیمان اور عباسیوں میں امین کثرتِ اکل میں مشہور ہیں۔
(ص ۲۶۷ جلد ۲)

بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے کہ "تنعم فی الماکل" کا جو الزام امیر معاویہ رض
کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور ان کے زمانہ میں بھی اور ان کے بعد
بھی بنی امیہ کی حکومت تک اس "تنعم" کا تعلق بجائے کیفیت کے زیادہ تر
کمیت یعنی مقدار کی زیادتی ہی معلوم ہوتا ہے[1]۔ البتہ بنی عباس کے ہاتھ میں

---

[1] اور سچ پوچھئے تو ایک حد تک "نتھا سونی" کا یہ طبقہ جو عموماً ہر ملک اور ہر زمانہ میں پایا
گیا ہے اپنی شکمی صلاحیتوں کی بنا پر کچھ مجبور بھی تو ہوتا ہے۔ آخر بیچارے کیا کریں انسانی
کھانے کی جو عام مقدار ہے اس سے اگر ان کی سیری نہ ہوتی ہو تو اس میں زیادتی آگے

جب حکومت آئی تو اسکے بعد کیفیت میں وہ رنگا رنگی پیدا ہوئی کہ بیان کرنیوالوں کے بیان پر مشکل ہی سے بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ ابراہیم بن مہدی جو ہارون کا حقیقی بھائی تھا اسی نے ہارون کی دعوت میں۔ دعوت سے پہلے ایک پیالہ پیش کیا۔ پوچھا گیا کہ کیا ہے؟ تو ابراہیم نے خلیفہ سے عرض کیا کہ ایک قسم کی مچھلی جس کی زبان

(باقی پچھلا) خود ان بیچاروں کا کیا قصور ہے؟ ہندوستان کی تاریخ میں بھی ان تنقاموں کا ایک گروہ مختلف زمانوں میں پایا گیا ہے۔ اکبری دربار کے امیر میر نمکین کے حالات میں لکھا ہے کہ "گویند اشتہا بسیار داشت۔ ہزار انبہ وہزار سیب فکری، و دو خربزہ یک یک منی، می خورد" آثر الامراء ص کے ان کو میر نمکین کا خطاب اس لئے دیا گیا تھا کہ سیند ھانمک کا جو پہاڑ پنجاب میں سندھ ساگر کے دوآبے میں واقع ہے۔ اسی پہاڑ کی نمکین چٹانوں سے رکابی۔ کٹورا منوا کر اکبر کی خدمت میں تحفہ پیش کیا تھا اسی لئے میر نمکین کے نام سے مشہور ہو گئے۔ مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ سیندھا نمک اس پہاڑی نمک کو کہتے ہیں کہ سندھ ساگر کے علاقے میں تقریباً بیس میل کے طول میں یہ پہاڑ واقع ہے۔ اسی کی طرف یہ نسبت ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ستر من پر حکومت ایک روپیہ محصول لیتی ہے۔ اسی میں ہے کہ لوگ نمکین پتھر سے طبق۔ سرپوش اور اقسام اقسام کے ظروف تراشتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ظروف سازی کا ایک عام اور مقبول رواج تھا۔ ابن حوقل نے بھی فارس کے ذیل میں دارابجرد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس علاقہ میں سفید، سیاہ، زرد، سرخ، سبز اور بھی ہر طرح کے رنگ کے متعدد نمک کے پہاڑ ہیں۔ ان کی چٹانیں زمین کے اوپر ہیں۔ لوگ نمک کی انہی چٹانوں سے تراش کر طبل۔ کھانے کی میز اور قسم قسم کے برتن بناتے ہیں اور فارس و بیرون فارس کے علاقوں میں جا کر بکتے ہیں۔ ص ۲۱۵ - ۱۲

لذیذ سمجھی جاتی ہے ان ہی مچھلیوں کی یہ زبان ہے" ہزار درہم صرف ایک پیالہ پر خرچ ہوئے تھے۔ ہارون کو ابراہیم کا یہ اسراف سخت ناگوار گذرا۔

ابن عساکر نے لکھا ہے کہ ہارون نے کہا کہ جب تک ہزار اشرفیاں میرے سامنے نہ لائی جائینگی جنہیں میں خیرات نہ کرلوں اس وقت تک میرا سے نہیں کھا سکتا" ابراہیم نے ہزار اشرفیاں پیش کیں۔ ہارون نے غرباء میں تقسیم کردینے کا حکم دیا اور ابراہیم کو مخاطب کر کے اس نے کہا" اوجوان تکون هذه کفارة سرفلک (مجھے امید ہے کہ شاید یہ تمہاری فضول خرچی کا کفارہ بن جائے)

اس کے بعد جس جام میں زبان آئی تھی اس کی قیمت ہارون نے دریافت کی معلوم ہوا کہ ایک سو ستر اشرفیوں میں خریدا گیا تھا۔ ہارون نے حکم دیا کہ ابھی اس کو باہر لیجاؤ اور سب سے پہلے جس فقیر پر نظر پڑے اسکو دیدو۔ ابراہیم کا بیان ہے کہ میں نے اپنے بعض ملازموں کو اشارہ کیا کہ جس فقیر کو یہ جام دیا جائے اس سے خرید کر واپس لے آؤ۔ ہارون تاڑ گیا۔ اس نے اشارہ کیا کہ فقیر کو جام دیتے ہوئے یہ بھی کہہ دینا کہ ڈھائی سو اشرفیوں سے کم میں اسے فروخت نہ کرے، یہی ہوا کہ ابراہیم کے ملازموں نے ڈھائی سو اشرفیاں دے کر اس جام کو فقیر سے خرید لیا (ابن عساکر صفحہ ۲۷۹ ج ۲)

اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود سے تجاوز کرنے کے باوجود اس وقت تک کھانے کی ان رنگینیوں کو عموماً پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ بظاہر عباسیوں میں ان چیزوں کی اشاعت کے ذمہ دار دربار کے ایرانی و رومی عناصر ہیں۔

ہارون کے دربار کے عیسائی طبیب بختیشوع کے متعلق ابن اصبع نے

لکھا ہے کہ گرمیوں میں جو چوزے مرغیوں کے وہ کھاتا تھا۔ خود اُسی کا بیان تھا کہ ان چوزوں کو غذا میں صرف بادام و پستہ دیا جاتا ہے۔ اور عرقِ انار پلا پلا کر ان کی پرورش کی جاتی ہے۔ اسی طرح جاڑوں میں وہ ان چوزوں کو چھلے ہوئے اخروٹ کھلواتا تھا اور دہی پلواتا تھا۔

لکھا ہے کہ بخور کے لئے کوئلے خاص طور پر بنوایا جاتا تھا یعنی اولاً جن لکڑیوں سے کوئلے بنائے جاتے تھے وہ لکڑیاں خود کسی خوشبو دار درخت کی ہوتی تھیں پھر جلی ہوئی لکڑیوں کو کوئلہ بنانے کے لئے جب بجھاتے تھے تو عرقِ گلاب جس میں مشک کافور بید مشک۔ پرانی شراب وغیرہ چیزیں ملی رہتی تھیں اُسی پانی کو چھڑک چھڑک کر آگ ٹھنڈی کی جاتی تھی۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کم از کم امراء کا بالائی طبقہ ان امیرانہ چونچلوں میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا۔ ہندوستان تک کا جب یہ حال تھا کہ ابوالفضل کی ایک دعوت کا نقشہ شاہ نواز خاں نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ یہ خداوند خاں دکنی کی ضیافت کا قصہ ہے۔ لکھا ہے کہ:۔

"خداوند خاں دکنی کے ہر ہر نوکر (جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہوگی عموماً وہ گورنری کے عہدوں پر سرفراز رہتے تھے) کے سامنے تو توقاب پلاؤ اور ایک ایک مسلّم بھنا ہوا بکرا اور سو سو چپاتیاں رکھی گئیں اور خود خداوند خاں کے سامنے بیسیوں رکابیاں چنی گئیں، جن میں مرغ، تیتر، بٹیرا اور قسم قسم کی بھاجیاں ترکاریاں تھیں۔" (صفحہ ۶۶۰)

(حاشیہ اگلے صفحے پر)

اور اس قسم کے واقعات مثلاً پیر محمد خان شروانی کے متعلق کہا ہے کہ "روزانہ ہزار قاب بر دستر خوانش می کشیدند" (مآثر الامراء ص ۱۷۶ ج ۳)

صفاری بادشاہ عمرو بن لیث کے متعلق الفخری نے لکھا ہے کہ چھ سو اونٹ

حاشیہ پچھلا صفحہ ابوالفضل کی اسی دعوت کے سلسلہ میں شاہ نواز خان مصنف مآثر الامراء نے جو خود اورنگ آباد کے رہنے والے تھے عجب فقرہ لکھا ہے یعنی خداوند خان کے سامنے بجائے مسلم بکرے کے مرغ، تیتر وغیرہ پرندوں کی پلیٹیں جو رکھی گئیں تو ان کو سخت ناگوار گذرا اور دسترخوان سے یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ پیش ماکباب مرغ آوردند از روئے استہزاد و مخریت بودہ (میرے سامنے مرغی کا کباب محض مجھ سے مذاق کرنے اور میری توہین کیلئے رکھا گیا) گویا ان کو حقیر خیال کرکے بجائے بکرے کے مرغی جیسی چھوٹی چیز دی گئی۔ لکھا ہے کہ اٹھ کر چلے ہی گئے اور ابوالفضل سے اخیر وقت تک صاف نہ ہوئے۔ حالانکہ خود اکبر نے بھی سمجھایا کہ ہندوستان میں معزز مہمانوں کے احترام کا یہی طریقہ ہے لیکن انکی سمجھ میں بات نہ آئی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ خداوند خان کے گو والد مشہدی تھے لیکن ماں ان کی حبشن تھی اور یہ کیفیت ان میں اپنی والدہ ہی کی طرف سے منتقل ہوئی ہوگی۔ مگر مجھے تعجب ہے کہ شاہ نواز خان نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد خدا جانے یہ فقرہ آخر میں کیوں لکھا ہے کہ

"انہیں ست کہ در ہندوستان اہل دکن بحماقت و سخافت عقل شہرت دارند" (ص ۲۶)

حبشی حماقت کو نہ معلوم کیوں انہوں نے بلاوجہ دکن کی طرف منسوب کر دیا ۱۲

پر اس کا سفری باورچی خانہ چلتا تھا۔ (ص ۲۳۲)

اس میں علاوہ طعامی عیاشیوں کے ممکن ہے کہ غربا پروری کا جذبہ بھی ان لوگوں کے سامنے ہو۔

اور یہی حال لباس کا تھا اس میں بھی تفریط کی ابتدا کا الزام لوگوں نے امیر معاویہؓ ہی پر لگایا ہے۔ بلکہ حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ جن دنوں امیر معاویہؓ حضرت عمرؓ کی طرف سے شام کے والی تھے اسی زمانہ میں ایک دفعہ مدینہ منورہ اس حال میں پہنچے کہ ایک خوبصورت سبز جوڑا ان کے بدن پر تھا۔ ان کے اس لباس کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ کی نگاہیں اٹھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ درہ لیے ہوئے سیدھے امیر معاویہؓ کے سر پر پہنچے اور

فجعل ضربا بمعاویۃ۔ معاویہ کو مارنا شروع کیا۔

فاروقی درہ ادھر مسلسل عمل میں مصروف تھا اور ادھر امیر معاویہؓ کی زبان سے یہ فقرہ نکل رہا تھا:

اللہ اللہ یا امیر المؤمنین — اللہ اللہ اے امیر المومنین! کیوں

فیم فیم۔ — کیوں؟

لیکن حضرت عمرؓ اس کا جواب بھی صرف درے سے دے رہے تھے۔ جب دے چکے ہوئے تو اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ آخر اس بیچارے نوجوان میں کیا بات آپ نے دیکھی جو درے کا مستحق قرار دیا۔ جواب میں آپ نے صرف اشارہ کیا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس سے سمجھا گیا کہ دماغ میں کچھ بلندی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی کا ازالہ مقصود تھا۔ حضرت عمرؓ کے اشارے سے یہی بات

لوگوں کی سمجھ میں آئی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امیر معاویہؓ کے بعد بنی اُمیہ کے امراء جو اب بنی اُمیہ کے شہزادے کہلانے لگے لباس میں بہت زیادہ آگے بڑھے چلے جاتے تھے۔ مگر اس میں بھی بجائے کیفیت کے کمیت ہی پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عہد تک زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ ہشام بن عبدالملک کے متعلق عقد الفرید وغیرہ میں لباسی تکلف کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس سے بھی کپڑوں کی کثرت ہی کا زیادہ پتہ چلتا ہے مثلاً یہ کہ حج میں جب ہشام گیا تھا۔ تو سات سو اونٹوں پر اُس کے ذاتی مصرف کے کپڑے لدے ہوئے تھے (عقد الفرید صـ۲۹۶ ج ۲)

اسی طرح جو قمیصیں وہ پہنتا تھا۔ جب گننے والوں نے انہیں گنا تو واللہ اعلم بالصواب بتایا گیا کہ ایک لاکھ بیس ہزار قمیصیں نکلیں اور دس ہزار ریشمیں ازاربند تھے (المستطرف صـ۱۴۰ ج ۲ بہ)

لیکن اس کے بعد پھر جن نفاستوں اور نزاکتوں کا مسلسل اضافہ ان سلاطین اور امراء نے لباس میں کیا اُنہیں کون بتا سکتا ہے۔ سونے اور چاندی کے تاروں سے زرکش کئے ہوئے کپڑے تو خیر کس شمار و قطار میں تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ جواہرات اور موتیوں کو ان کپڑوں میں طرح طرح سے کھپانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترکی بادشاہ مراد نے شاہ جہاں کو جو تحائف میر ظریف کی معرفت بھیجے تھے اُن میں ایک قبا تھی جو مروارید صادق سے بنی گئی تھی۔ خیال تو کیجئے کہ بنی آدم نے پتوں سے لباس کے مسئلہ کو شروع کیا۔ جیسا کہ قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ پھر شاید چمڑوں سے ستر پوشی کا کام لوگوں

لے لیا۔ تب اُون پر آ گئے۔ اُون سے روئی اور کتان تک پہونچے، آخری پرواز ریشم تھی۔ لیکن بادشاہوں اور ان کے درباریوں نے سونے چاندی کے تار کھچوا کر ریشم اور اُون کے ساتھ ان کو شریک کیا اور آخری انتہا اس کی یہ ہوئی کہ عبائے مروارید دُوز تک بات پہنچ کر رہی۔ (مآثر الامراء ص۱۱ ج۱)

آدم کی اولاد جب تکلّف کی طرف بڑھتی ہے تو جہاں تک جس چیز کو وہ پہنچا کر رہے کم ہے۔

المقریزی نے ابن طولون والی مصر کی پوتی قطر الندی جو خلیفہ معتضد باللہ سے بیاہی گئی تھی اسکے جہیز کی جو فہرست لکھی ہے اور جو کچھ اس میں تھا وہ تو خیر تھا ہی۔ میں تو ان الفاظ کو پڑھ کر دنگ رہ گیا کہ :-

"جہیز کی اسی فہرست میں ہزار ازار بند تھے جن میں ہر ازار بند کی قیمت دس دس اشرفیاں (اور وہ بھی مصری اشرفیاں تھیں" (مقریزی ص۳۱۹ ج۱)

قریب قریب ڈھائی ڈھائی سو روپے کا ایک ازار بند اس حساب سے پڑتا ہے۔ انتہا ہے اس زر پرستی کی۔ ؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کے تکلّفات سلاطین و امراء ہی کی حد تک محدود تھے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی غلط ہے کہ عوام اس زمانہ میں فقر مدقع (کمر توڑ دینے والے) افلاس میں مبتلا تھے۔ گذشتہ مثالیں غالباً میرے بیان کی تائید کے لئے کافی ہیں۔

بہر حال غیر ضروری مصارف کے متعلق تو میں نہیں کہتا لیکن عام ضروریات

زندگی، خورد و نوش، لباس، مکان وغیرہ کی حد تک عام مسلمانوں کا ایک معیار ضرور قائم ہو گیا تھا۔ جسکی وجہ یہی تھی۔ یعنی باوجود مذہب اور دین ہونے کے اسلام نے رہبانی اور ریاستی زندگی سے صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کو روکا نہیں تھا بلکہ روکنے والوں کو تو قرآن میں ڈانٹا گیا ہے، پوچھا گیا ہے کہ "الطیبات من الرزق" یعنی صاف ستھرے پاکیزہ کھانوں اور آرائش و زیبائش کیلئے جن چیزوں کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ اُن کو حرام کرنے والے کون ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ خود صحابہ اور صحابہ کے بعد بھی عمومی طور پر لوگوں کا طعام و لباس میں بھی وہی حال تھا جو پہلے مکانوں کے سلسلہ میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بیان کیا ہے۔ لوگ اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے لیکن حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ عبدالکریم ابو امیہ مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے بدن پر موٹے اُون کا لباس ہے۔ تو میں نے کہا:

ھذا زی الرھبان وان المسلمین اذا تزاوروا تجملوا۔	یہ تو تارک الدنیا عیسائی فقیروں کا بانا ہے مسلمانوں کو تو چاہیئے کہ باہم ایک دوسرے سے جب ملاقات کریں تو اسی وضع میں
(طبقات ابن سعد ص۸۳ ج۷)	ملنا چاہیئے جس سے جمال کا اظہار ہو۔

صوفیائے اسلام کے سرخیل خواجہ حسن بصری کے حوالے سے طبقات ہی میں ہے۔ لکھا ہے کہ ان کی مجلس میں اُن لوگوں کا ذکر ہوا جو فقیرانہ خرقہ اور گودڑ پہنتے ہیں تو آپ نے فرمایا:

اکنوا الکبر فی قلوبہم	دلوں میں کبر اور بڑائی کے جذبہ کو چھپائے

واظھروا التواضع فی لباسھم
واللہ لاحدھم اشد عجبا
بکسائہ من صاحب مطرف
بمطرفہ
(طبقات ابن سعد ص۱۴۳ ج۸)

ہوئے ہیں اور بظاہر فروتنی اور خاکساری ظاہر کرتے ہیں۔ خدا کی قسم اپنے خرقہ پر ان میں ہر ایک اسی درجہ نازاں ہے جتنا کہ ایک دوشالے والا اپنے دوشالے پر ناز کرتا ہے۔

مدینہ کے فقہائے سبعہ جن کے متعلق لوگوں نے اس تجربہ کو مشہور کیا ہے اور کم از کم میں نے تو اس تجربہ کو صحیح پایا ہے کہ ان کے مبارک اسماء کو لکھ کر دردِ سر والے کو اگر دم کیا جائے تو فوراً دردِ سر میں کمی ہو جاتی ہے۔ ان میں سے حضرت عروہ اور حضرت قاسم کے متعلق ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ حضرت عروہ روزانہ غسل کے عادی تھے۔ ملحفہ جو اوڑھتے تھے تو وہ ہلکے زعفرانی رنگ کی ہوتی تھی لیکن اتنی نفاست سے وہ رنگی جاتی تھی کہ ایک دینار رنگوائی کا معاوضہ ادا کرتے تھے۔ (ابنِ سعد ص۱۳۳ ج۵)

عہدِ صحابہ میں ایک خاص قسم کا کپڑا جس کا نام خز[1] تھا۔ بہت مقبول ہوا۔ طبقاتِ ابنِ سعد سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی صحابی ایسے تھے جو اس کپڑے کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کپڑے

---

[1] خز کی تشریح میں لوگ مختلف ہیں لیکن طبقات ابن سعد سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ سدی (بانا) تو اس کا ریشم (حریر) کا ہوتا تھا۔ اور لحمہ (تانا) اس میں مختلف چیزیں مثلاً سوت یا کتان یا اون استعمال کرتے تھے۔ پھر اون کی نوعیت بھی مختلف ہوتی تھی جن جن جانوروں کے اون خصوصی طور پر نرم اور ملائم ہوتے تھے انہی کا (بانا) آگے

کی قیمت بھی کافی ہوتی تھی۔ ابنِ سعد ہی میں ایک جگہ خز کے مطرف کا دام ستاسو درم بتایا گیا ہے۔ (صفحہ ۵۴/۵ ج)

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر صحابہ اور تابعین اس خز کے کپڑے کو بکثرت استعمال کرتے تھے۔ حضرت قاسم کے حالات میں لکھا ہے کہ:-

"کبھی کبھی برآمد ہوتے اور ان کا جبہ بھی خز کا چادر بھی خز ہی کی عمامہ بھی خز ہی کا۔ عمامہ کے نیچے ٹوپی بھی خز ہی کی ہوتی"۔

حالانکہ اسی طبقات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام سوتی کپڑوں کی قیمت اس زمانہ میں بھی قریب قریب وہی تھی جو آجکل ہے۔ یعنی لنگی سوتی تین درم میں اور کرباسہ راز یہ جس سے کرتہ قمیص وغیرہ بناتے تھے کل بارہ درم میں بنجاتا تھا۔ دیکھو طبقات ابنِ سعد صفحہ ۸۲ ج ۷)

سچ تو یہ ہے کہ تین درم یعنی قریب قریب بارہ آنے میں سوتی لنگی آج بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

(باقی پچھلا) تاگہ بنا کرتانا بنایا جاتا تھا۔ اسی لئے بعض لوگ لکھدیتے ہیں کہ نرخرگوش کا اون ہوتا تھا۔ بعض لکھتے ہیں کہ بحیرۂ خزرا ور ترکوں کے ملک سے لومڑیوں کے بال سے جو تاگا بنایا جاتا تھا اس سے اس کا تانا تیار ہوتا تھا۔ بعضوں نے بعض دریائی جانوروں کا بھی نام خز کے سلسلے میں لکھا ہے جنکے بال لمبے لمبے ہوتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ تانے میں سب ہی چیزیں استعمال کرتے تھے اُونی خز کو سردیوں میں اور سوتی و کتانی کو گرمیوں میں استعمال کرتے ہوں گے۔ کیونکہ ہر زمانے میں دیکھتے ہیں کہ خز استعمال کرتے تھے۔ اس کپڑے کا رنگ بھی مختلف ہوتا تھا یعنی جس قسم کا رنگ لوگ پسند کرتے تھے اُسی قسم کا رنگ چڑھا دیا جاتا تھا ۱۲

عام استعمالی کپڑوں کی ان ہی ارزانیوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے عہد میں ستر پوشی کے مسئلہ میں کبھی کسی ملک اور کسی زمانہ میں کسی قسم کی شکایت کی روایت کتابوں میں نہیں ملتی۔ کھانے پینے کی چیزوں کا حال شوا ان کی ارزانیوں کا ذکر تو پہلے بھی آچکا ہے۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے مسلمانوں میں فواکہ اور فواکہ کے بعد گوشت۔ مچھلی یہ ان کی مرغوب غذائیں معلوم ہوتی ہیں ابن حوقل ہو یا الہمدانی، خرداذبہ ہو یا اصطخری ان سب کی کتابیں مسلمانوں کی عام آبادیوں کی اس خصوصیت سے بھری ہوئی ہیں یعنی ہر جگہ بتاتے ہیں کہ مختلف قسم کے میووں اور پھلوں کے باغات سے وہ گھری ہوئی ہیں۔ تھوڑی بہت تفصیل اسکی گذشتہ اوراق میں آپ پڑھ بھی چکے ہیں۔

اور یہی حال ان مویشیوں کا ہے جن کا گوشت عموماً مسلمان استعمال کرتے تھے۔ پکانے میں بھی لطافت اور پاکیزگی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ سرتاج صوفیہ خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تک جیسے حضرات غذائی لطافتوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ طبقات میں ہے کہ بیان کرنے والے بیان کیا کرتے تھے کہ:-

کان الحسن یشتری لحما کل یوم بنصف درهم وقال ما شممت من قدر قط اطیب من ریحا من قدر الحسن	حسن بصری روزانہ نصف درہم کا گوشت خریدا کرتے تھے۔ انکے شوربے کی جیسی خوشبو میں نے کسی شوربے میں نہیں پائی۔

(طبقات ابن سعد ص۱۲۱ ج ۷)

یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب بصرہ اپنے تمدن و عمران کے انتہائی نقاط تک گویا پہنچ چکا تھا۔ لیکن گوشت کی ارزانی کا اس سے اندازہ کیجئے کہ خواجہ حسن بصری

جن کا کنبہ بھی اچھا خاصا تھا۔ نصف درہم کا گوشت دونوں وقت کیلئے ان کے یہاں کافی ہو جاتا۔ قریب قریب دو آنے یومیہ کا اوسط پڑتا ہے اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گوشت اس زمانے میں مسلمانوں کی روزمرہ کی غذا میں شریک ہو چکا تھا۔ اگرچہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روزانہ گوشت کھانے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ صحابی کو ایک دفعہ آپ نے ڈانٹا بھی تھا۔ (تیسرا لوصول)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بتدریج یہی رواج غالب آ گیا، جو قریب قریب اس وقت تک جاری ہے۔

طبقات ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ نفاست پسند حضرات عام بازاری گھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ عامر بن عبدالقیس کے ذکر میں ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ گھی کے متعلق ان سے جب دریافت کیا گیا تو بولے کہ۔

اکل من ھٰھنا واشار الی البادیة وھاھنا واشار الی الجبل	میں یا تو اس گھی کو کھاتا ہوں جو یہاں سے آتا ہے اور بادیہ (صحراء) کی طرف اشارہ کیا۔ یا جو گھی وہاں سے آتا ہے اور پہاڑ کی طرف اشارہ کیا۔
(طبقات ابن سعد ص ۵۷ ج ۷)	

اسی طرح بعض لوگ عام کھیتوں کی ترکاریاں اور بھاجی بھی اس لئے استعمال نہیں کرتے تھے کہ ان کے کھیتوں میں غلاظت وغیرہ کھاد کے طور پر ڈالی جاتی ہے۔

رفیع بن مہران ابو العالیہ کے ذکر میں ابن سعد نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے باغ سے انکے پاس ترکاریاں

بھیجیں۔ جو بغیر کھاد کے اگائی جاتی تھیں تو اُن کو انہوں نے شوق سے لیا اور
ایک صاحب سے عام ترکاریوں اور بقول کے متعلق فرمایا کہ:۔

تنبت فی منبت خبیث نعلم ماھو	یہ ترکاریاں نہایت گندی جگہوں میں پیدا
قلت ماھو قال تحرٌ والبول و	ہوتی ہیں۔ مخاطب نے پھر پوچھا کہ وہ
الحائض[1] (طبقات ابن سعد ص۸۲)	گندگی کیا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ
	غلاظت، پیشاب، حیض وغیرہ

ابوالعالیہ الریاحی کا شمار اگرچہ کبار تابعین میں ہے لیکن ابتداء میں یہ بھی موالی میں سے تھے۔ بعد کو ان کی مالکہ عورت نے ان کو آزاد کر دیا تھا۔ پھر علم حاصل کیا اور بڑے آدمی ہوئے۔ مزاج میں بڑی لطافت تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ کھاد کی پیدا کی ہوئی ترکاریاں نہیں کھاتے تھے۔ ان ہی کے حال میں یہ بھی لکھا ہے کہ "شکر" جو یہ استعمال کرتے تھے وہ مختلف مہر لگی ہوئی پڑیوں میں محفوظ رہتی تھی۔ لکھا ہے کہ:۔

سکر مختوم فحص الخاتم وا	ملازم مہر زدہ پڑیوں میں شکر کی ڈلیاں
عطاہ عشر سکوات	لایا۔ تب آپ نے دس ڈلیاں شکر کی
(ایضاً ص۸۳ ج۷)	ملازم کو عطا کیں۔

---

[1] لیکن سنن بیہقی میں حضرت سعد بن وقاص فاتح ایران رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ روایت نقل کی ہے کہ اپنی زمین کا کھاد خود اپنی پیٹھ پر لاد کر لے جاتے اور ڈالتے اور فرماتے کہ کھاد کا ایک تھیلا گیہوں کا ایک تھیلا ہے۔ میری کتاب "اسلامی معاشیات" میں اس قسم کی چیزیں تفصیل سے ملیں گی۔ ۱۲

اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شکر کو ڈلی کی شکل میں ڈھال لینے کا رواج اُسی زمانے میں ہو چکا تھا اور یہ پہلی صدی ہجری کے واقعات ہیں۔ گویا دُنیا جس زمانے میں صرف راب اور گڑ میں چپکی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی لطافت طبعی نے اسکو صفائی میں ترقی کے اُس آخری زینے تک اُسی زمانے میں پہنچا دیا تھا جس سے آگے اس میں اس وقت تک ترقی نہیں ہوئی ہے۔ جرجی زیدان تک نے یہ مانا ہے اور برٹانیکا انسائیکلو پیڈیا میں "شوگر" پر جو مقالہ ہے اس سے یہ فقرہ اس نے نقل کیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے :-

"سارے عالم میں شکر کی عام اشاعت مسلمانوں ہی کے ذریعہ سے ہوئی۔ مسلمانوں ہی نے اس کے اصلی وطن (ہندوستان) سے اسکو فارس پہنچایا اور پھر کارخانے قائم کر کر کے اسکی مختلف قسمیں انہوں نے پیدا کیں جنکی اس سے پہلے کوئی نظیر موجود نہیں"

یعنی گنّے سے رس نکالکر اس کو پکانا پکا کر راب اور گڑ بنانے کی صنعت یہ تو ہندوستان میں بہت زمانے سے جاری تھی۔ لیکن اس سے آگے قدم ہندوستان نے نہیں بڑھایا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت تک بھی اس مسئلہ میں اپنے پرانے ہی مقام پر ہے۔ عام طور پر دیسی طریقے سے ہندوستان میں گڑ اور راب زیادہ سے زیادہ کچی کھانڈ تک لوگ بنا تے ہیں۔ لیکن یہ راز کہ گنّے کے اس عرق میں بلّوریت تک پہونچنے کی صلاحیت ہے، بظاہر اس کے موجد مسلمان ہی معلوم ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصّواب۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی صدی ہجری میں اس کو ارتقا کی اس منزل تک پہنچا دیا تھا۔

مسلمانوں کے اس عہدِ حیات میں اُن کی زندگی کا جو نظام تھا۔ ان سیاحوں کی زبانی اس کے قصے سن سن کر آج بھی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ مقدسی صابور نامی ایک ایرانی علاقہ کا ذکر ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ اس خطہ کے ایک ایک باغ میں کھجور، زیتون، ترنج، خرنوب، اخروٹ، بادام، انجیر، انگور، بیر، گنے، بنفشہ چمیلی، الغرض مذکورہ بالا سب طرح کے فواکہ، پھل پھول تمکو نظر آئیں گے کہ ہر دو کو ان باغوں میں رقص کناں پاؤ گے۔ آبادیاں قریب قریب ہیں۔ میلوں میل تم درختوں کی چھاؤں میں چلے جاؤ گے۔ پھر اس زمانہ میں نان بائیوں کی دکانوں کا جو نظم اسلامی ممالک میں قائم تھا اُس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"ہر تین میل پر نان بائی کی دکان تم کو یقیناً ملے گی اور وہیں پر بقال کی دکان بھی ہوگی۔" (المقدسی ص۳۴۴)

اسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔ والشواش دکاکین علیٰ حدۃ — کباب والوں کی دکانیں الگ رہتی ہیں۔ (ایضاً ص۴۴)

اور سچ تو یہ ہے کہ قوموں میں جب زندگی ہوتی ہے تو اس زندگی کے آثار ہر شعبہ میں محسوس ہوتے ہیں۔ غذاؤں ہی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات ایران کے شہر دارابجرد کے متعلق لکھی ہے کہ خدا جانے یہاں کے باشندوں نے کہاں سے مچھلیوں کی ایک ایسی قسم ڈھونڈ نکالی تھی کہ ابن حوقل کہتا ہے:۔

بدارابجرد خندق من الخندق المحیط بالبلد فیہ سمک — دارابجرد شہر کے چاروں طرف جو تالاب ہے اُسمیں ایک خاص قسم کی مچھلی ہوتی ہے

فيه لا عظم ولا فقار يكن له فلوس (ابن حوقل ص ۲۸)

جس میں نہ کانٹے ہوتے ہیں نہ ہڈیاں نہ ریڑھ کی ہڈیاں لیکن بالائی جسم پہ چھلکے (فلوس) ہوتے ہیں

اور طرفہ لطیفہ جو اسی ابن حوقل کا ذاتی تجربہ ہے یہ ہے کہ کھانے کے بعد اس نے یہ فیصلہ دیا کہ

وهو عندی الذ السموك

"تمام مچھلیوں میں یہ مچھلی میرے خیال میں لذیذ ترین مچھلی ہے۔

یہ ایک ایسے شخص کا بیان ہے کہ جسے ہم جہاں نیاں جہاں گشت کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فلوس (چھلکے) والی مچھلیوں کی یہ خصوصیت یقیناً عجیب ہے کیونکہ بغیر فلوس کی مچھلیوں میں کبھی یہ دیکھا گیا ہے کہ ان میں کانٹے کم ہوتے ہیں۔ لیکن اتنی لذیذ نہیں ہوتیں، بلکہ امامیہ فرقہ کے مسلمان تو ان کو مچھلی ہی نہیں سمجھتے اسی لئے کھانے سے احتراز کرتے ہیں۔

ضرورت کہیے یا جستجو اور تلاش، کن کن چیزوں کو نہیں پیدا کر دیتی۔ گھاس کھانے والے یا نباتات خوار جانوروں کے متعلق یہ کتنی عجیب بات ہو گی کہ گوشت اور مچھلی ان کی غذا بنا دی جائے۔ لیکن ابن حوقل ہی نے حضر موت کے علاقے مہرہ کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:۔

"مہرہ (عرب کے جس علاقے کا نام ہے) اس کے مرکزی شہر کا نام الشجر ہے۔ یہ بالکل بنجر اور بن کھیتی کا اُجاڑ بیابان ہے، ان

لوگوں کی زبان بھی کچھ نامفہوم سی ہے۔ ان کے ملک میں نہ تو
نخلستان ہی ہیں اور نہ کسی قسم کی کھیتی، ان کی ساری دولت بس
اونٹ ہیں۔ اور بھیڑ بکریاں "۔

سوال یہ ہے کہ آخر ان مویشیوں کو وہ کھلاتے کیا تھے۔ اسی کا جواب ابنِ حوقل نے دیا ہے کہ:۔

"یہ اپنے اونٹوں اور تمام مویشیوں کو ایک قسم کی مچھلی کھلاتے ہیں۔ جو چھوٹی چھوٹی ہوتی ہے۔ نام اس مچھلی کا ورق ہے "۔
(ابنِ حوقل صـ۳۲)

لیکن اس مچھی خوراک کا ان کی مویشیوں پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ اس کا بھی جواب سنئے۔ وہی لکھتا ہے کہ:۔

"ان کے یہاں بختی قسم کے جو اونٹ ہیں۔ وہ اپنی چال میں بھی اور محنت وجفاکشی میں بھی دنیا کے تمام بختی اونٹوں سے بہتر ہیں"۔

یہ حال تو اونٹوں کا ہوا۔ بھیڑ بکریوں کے دودھ کی کیفیت یہ ہے کہ:۔

"ان ہی بکریوں اور بھیڑوں کے دودھ اور مچھلیوں سے ان کی زندگی ہے۔ ان کے سوا روٹی یا اس قسم کی دوسری غذاؤں کے وہ قطعاً ناواقف ہیں "۔ (ابنِ حوقل صـ۳۲)

خورد و نوش کی اس بحث کو ختم کرتے ہوئے، کھانے پینے کی تہذیب جو اس زمانہ میں مسلمانوں میں مروج تھی۔ اس کا ذکر بھی سن لیجئے۔ فارس کے ذکر میں ابنِ حوقل نے لکھا ہے کہ:۔

"عام طور پر سلیقہ شعاری اور وضع کی پابندی ایک عام دستور ہے نیز باورچیخانوں اور دسترخوانوں کے متعلق خاص سلیقے سے کام لیا جاتا ہے۔"

یہ سلیقہ کیا تھا؟ اس کی تفصیل ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"کھانا عموماً گھروں میں کثرت سے پکتا ہے، اور دسترخوانوں پر بھی جو کھانے چنے جاتے ہیں۔ اُن کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے لزوماً ہر کھانے میں میٹھا اور پھلوں کا ہونا ناگزیر ہے، دسترخوان بچھنے سے پہلے رسمتائیاں اور میوے پیش کیے جاتے ہیں۔ کھانے کے وقت دسترخوان پر گفتگو میں اس کا خاص لحاظ کیا جاتا ہے کہ شریفانہ درجہ سے گری ہوئی کوئی بات زبان سے نہ نکلے، بے حیائیوں کے اعلانیہ اظہار سے سخت پرہیز کیا جاتا ہے گھروں کو بھی اور دسترخوانوں کو بھی ہمیشہ پاک صاف رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں گویا باہم ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔" (ابن حوقل ص۳۲۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا عام طبقہ خواہ خالص اسلامی تعلیم سے جس حد تک بھی دور ہوتا چلا جا رہا ہو لیکن اعتدال کے جس نقطۂ عدل پر اسلامی تعلیمات کی بنیاد قائم ہے اُسی کا اثر یہ تھا۔ اور میں تو خیال کرتا ہوں کہ اب تک اسی کے آثارِ باقیہ کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا کی قوموں میں بعض اقوام کو اگر ایک طرف اس حال میں دیکھا جا رہا ہے۔ کہ کھانے میں اب تک انہوں نے درخت کے ان پتوں

کے استعمال کو ترک نہیں کیا ہے جن پر شاید نسلِ انسانی کے ابتدائی طبقات نے کھانا کھانے کی ابتدا کی ہوگی۔ پینے میں اب بھی بجائے گلاس اور پیالے کے ہاتھ کے چلّوؤں سے پانی پینے کی مشق ان کا ایک دلچسپ مشغلہ بلکہ شاید آرٹ ہے۔ پہننے میں پتّوں کے لباس کو تو انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ لیکن بے سلے کپڑوں کے پہننے پر ان کا اصرار اب تک باقی ہے۔ رہنے میں اس وقت تک ان کے بڑے سے بڑے خاندان کے لئے ایک دو کوٹھریاں کافی ہیں۔ بجائے دیواروں کے حجاب اور آڑ کا کام زیادہ تر رات کی تاریکیوں سے لیا جاتا ہے۔

الغرض زندگی کے تمام شعبوں میں پستی اور تنزل کا جو آخری نقطہ ہو سکتا ہے اس وقت تک اس پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اس سے ہٹنا نہیں چاہتے ان ہی کے مقابلہ میں بعض دوسری قومیں ہیں کہ آلو کی ایک قاش گوشت کی ایک ایک بوٹی کیلئے مستقل پلیٹ کی کھانے میں ان کو ضرورت ہے۔ پانچ چھ آدمیوں کی ٹولی اس وقت تک کھانے کی میز پر بیٹھ نہیں سکتی جب تک چالیس پچاس پلیٹوں کا نظم نہ کر لیا جائے۔ یہی حال لباس کا ہے کہ صبح و شام دوپہر الغرض دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں معمولی معمولی تغیرات پر خاص خاص وضع کے لباسوں کا بدلنا ان کے ہاں ضروری ہے۔ جن کپڑوں میں جاگتے ہیں اُن ہی میں سونا ان کے لئے ناممکن ہے۔

مکان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک جوڑے کے لئے بھی ایسا مکان کافی نہیں ہو سکتا جس میں سونے، بیٹھنے، کھانے، آرائش و زیبائش، ملاقات اور خدا جانے کن کن چیزوں کیلئے الگ الگ کمرے نہ ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سابق الذکر قوموں کی پست زندگی کے مقابلہ میں انہوں نے اپنے عوام و خواص کی زندگی کو بلندی کے ایک ایسے نقطہ پر پہنچا دیا ہے کہ وہاں تک پہونچنے کی کوششوں نے ان کی زندگی کو ان پر دوبھر بنا دیا ہے۔ گویا باہر کی اس حیثیت کی تعمیر سے اندر کو ایک دوامی جہنم کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

مگر آپ دیکھ رہے ہیں زندگی کے ان ہی شعبوں میں مسلمانوں کا اول سے آخر تک کیا حال رہا ہے۔ اس سلسلے میں بطورِ مثال کے مسلمانوں کے مکان اور لباس ہی کو لیجئے جسکے واقعات اور مشاہدات کافی حد تک گذر چکے ہیں۔

کپڑے کی حیرت انگیز پائیداری

بہرحال مکانوں کے متعلق مسلمانوں کا اس زمانہ میں جو عام مذاق تھا یعنی اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ بنانے والے پر خلود کے مغالطہ میں مبتلا ہو جانے کا الزام قائم نہ ہو۔ اور یہ کہ ویرانی کے بعد ان کے کھنڈروں کی شکل ڈراؤنی نہ بن جائے ٹھیک اسی کے مقابلہ میں لباس کے متعلق ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاں تک پائیداری اس میں پیدا ہو سکتی تھی اس کے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ابن حوقل وغیرہ نے اس زمانہ میں کپڑوں کے جو حالات بیان کئے ہیں۔ اگر ان پر اعتبار کیا جائے تو اس کے گویا یہ معنی ہوں گے کہ اپنی پوری زندگی میں تین چار دفعہ سے زیادہ لباس کی تیاری کی جھنجھٹوں میں مبتلا ہونے کی ان لوگوں کو شاید ضرورت نہ ہوتی ہوگی۔ آپ خود خیال کیجئے۔ اسی ابنِ حوقل کا بیان ہے کہ

کسی ایک جگہ نہیں بلکہ اس زمانے میں مختلف ممالک مثلاً یمن عدن اور ایران کے مختلف شہروں میں ایسے کپڑے بنے جاتے تھے کہ ان کی بقا کی مدت :

اقلہ من الخمس سنین الی عشرین سنۃ (ص ۲۲۳) پانچ برس سے بیس برس تک ہوتی تھی۔

بیس بیس سال تک جو کپڑے باوجود کثرتِ استعمال کے نہ پھٹتے ہوں تو خود سوچئے کہ اس کا مطلب کیا ہوا۔ آدمی کی اوسط عمر ساٹھ سال اگر فرض کی جائے تو تین دفعہ سے زیادہ کیا لباس بنانے کی اسکو ضرورت ہوگی؟ اور کم از کم پانچ سال جن کپڑوں کی زندگی کی مدت اس نے بتائی ہے شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ ان مقامات کے یہ کپڑے جو گھٹیا قسم کے ہوتے ہوں گے ان کی پائداری کی مدت پانچ سال ہوتی ہوگی۔

ان ہی کپڑوں کے سلسلے میں ابن حوقل نے خراسان کے شہروں اور وہاں کے مختلف مصنوعات کا ذکر کرتے ہوئے سمرقند کے قریب ایک جگہ ویذار نامی تھی۔ اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور اسکی خصوصیت ہی یہ بیان کی ہے کہ مشہور سوتی کپڑا جو عموماً بازاروں میں "ویذاری" کے نام سے مشہور ہے وہ یہیں تیار ہوتا ہے۔ اس موقعہ پر جب میں پہنچا تو ہدایہ کا خیال آگیا۔ مختلف مقامات میں اس کتاب کے اندر بعض مسائل کے تذکرے کے سلسلے میں "ثوب ویذاری" کا صاحب ہدایہ نے ذکر کیا ہے۔ شروح و حواشی والے تو صرف اتنا لکھ کر گذر جاتے ہیں کہ ایک مقام ہے جس کی طرف یہ کپڑا منسوب ہے۔ لیکن ابن حوقل سے اسکی تفصیل معلوم ہوئی اس نے لکھا ہے کہ :-

"دراصل یہ ایک قسم کا "قطنی" (کوٹن) کپڑا ہے۔ سمرقند سے چھ میل پر ایک شہر ویذار نامی آباد ہے، اسی میں یہ بنایا جاتا ہے۔ اس کپڑے کی خوبی یہ ہے کہ بغیر دھوئے یونہی کارخانے سے نکلنے کے بعد بھی لوگ اسکو پہنتے ہیں"

جس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں سوتی کپڑوں کو استعمال سے پہلے عموماً ان کو دھلوانا شاید ضروری تھا۔ بہر حال اس کے بعد اس کپڑے کی خصوصیتوں کو بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ:-

"رنگ اس کا مائل بزردی ہوتا ہے[1] اور اس میں خاص قسم کی نرمی ہے چھونے میں اچھا معلوم ہوتا ہے، کپڑا ذرا موٹا اور دبیز ہے"

---

[1] اسلامی عہد کے کپڑوں کی ایک یادگار جسے حکومت آصفیہ نے حال میں کچھ دنوں سے نئی زندگی عطا کرنے کی کوشش کی ہے اسے ہمرو کہتے ہیں اورآجکل اورنگ آباد (دکن) میں کچھ دنوں سے حکومت کی حوصلہ افزائیوں کی وجہ سے پھر تیار ہونے لگے ہیں یہ واقعہ ہے کہ کچھ اس قسم کی بناوٹ اسکی ہوتی ہے کہ پھٹنے کا اس کے کوئی احتمال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے تو لوگوں کو دیکھا ہے کہ بالا غرض اگر ہمرو کی شیروانیاں کسی کو وہ دیتے دیتے ہیں۔ کیونکہ آپ خواہ کچھ کیجئے۔ کسی طرح استعمال کیجئے۔ وہ نہ گھسنے کا نام لیتے ہیں اور نہ مسکنے کا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اسی قسم کی چیز ان علاقوں میں بنتی تھی ۱۲-

اور آخر میں سب سے بڑی خصوصیت اسکی بھی بیان کی ہے اور خود اپنا تجربہ لکھا ہے کہ :-

"میں نے خود ایک سے زاید کپڑے ایسے پانچ پانچ سال تک استعمال کئے ہیں"۔

خدا جانے پانچ سال کے بعد بھی وہ پھٹتے تھے یا تنگ آکر جیلی(؟) اس قسم کے کپڑوں کو آخر کسی کو لوگ دیدیا کرتے ہیں۔ ابن حوقل بھی کسی کو دیدیا کرتا ہوگا۔

خیر یہ سب تو اپنی جگہ ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں جس چیز کا پیش کرنا مقصود ہے وہ ابن حوقل کا یہ فقرہ ہے :-

ولیس بخراسان امیرا و وزیر	خراسان میں نہ کوئی ایسا امیر ہے، نہ وزیر
او قاض او تاني او عامي	ہے، نہ قاضی ہے، نہ دفتری کارندہ، نہ عامی
او جندي الا یلبس الثیاب	نہ فوجی آدمی جوان دیلاری کپڑوں کو
الویذاریة (ابن حوقل ص۴۰۲)	استعمال نہ کرتا ہو۔

کپڑے یا جن چیزوں کے کپڑے بنتے تھے اُن کے متعلق بعض جزئی باتوں کا ابن حوقل نے کہیں کہیں اور بھی تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً شنیبر فارس کے ایک قصبہ کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ لکھتے ہوئے کہ یہاں منبر بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

"اسی قصبہ میں کتان سے ایک خاص قسم کا کپڑا بنایا جاتا ہے جسکے متعلق بالاتفاق لوگ کہتے ہیں کہ عطر اور خوشبو کا اثر اپنی نرمی اور خوبی سے جس قدر جلد اور دیر تک قبول کئے رہتا ہے، یہ بات کسی اور کپڑے میں نہیں پائی جاتی"۔ (ابن حوقل ص۱۷۵)

اسی طرح مختلف مقامات کے ذکر میں جہاں دوسرے مصنوعات کا تذکرہ کیا ہے، وہیں کپڑوں کی خاص خاص قسم جہاں جہاں بنتی تھی اُن کو بھی بتاتا چلا گیا ہے

مثلاً تستر کے ذکر میں لکھتا ہے:۔

"یہیں وہ مشہور دیباج (ریشمین کپڑا) بنتا ہے جو ساری دنیا میں برآمد ہوتا ہے۔ اور بیت اللہ کیلئے ایک پردہ یہیں سے بن کر جاتا تھا" (ص ۱۷۵)

یا مرو کے ذکر میں لکھتا ہے کہ:۔

"یہاں سے ابریشم اور ابریشم کے کودے برآمد کئے جاتے ہیں اور یہیں سے مرو کی وہ خاص روئی بھی برآمد ہوتی ہے جسکے بنے ہوئے کپڑے مرو کی طرح سارے جہان میں مشہور ہیں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ یہ روئی حد سے زیادہ نرم، مرو میں اس روئی سے کپڑے بھی بُنے جاتے ہیں اور دُنیا کے مختلف حصّوں میں روانہ ہوتے ہیں (ابن حوقل ص ۳۱۶)۔

کابل اور نصبیّا کی پارچہ بافی

کابل کے ذکر میں یہی ابنِ حوقل لکھتا ہے کہ:۔

یرتفع من کابل ثیاب حسنة	کابل سے بہترین سوتی کپڑے باہر بھیجے جاتے
من قطن یعمل منھا سنبیات	ہیں۔ سنبیات (انہی کابلی کپڑوں سے)
وتدخل الی الصین وتخرج	بنتے ہیں۔ چین بھی جاتے ہیں، اور
الی خراسان و تبعث	خراسان کی طرف بھی روانہ ہوتے ہیں
بالسند واعمالھا۔	سندھ اور اُس کے ملحقہ علاقوں میں
(ابنِ حوقل ص ۳۲۸)	بھی بھیجے جاتے ہیں۔

اگر ابن حوقل اُونی کپڑوں کا ذکر کرتا تو شاید مجھے تعجّب نہ ہوتا۔ اگرچہ اسوقت

تو یہ بھی اچنبھے ہی کی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ آنکھیں یہ دیکھنے کے لئے تو ترس ہی گئی ہیں جیسا کہ ابن حوقل ہی نے خوزستان یعنی آہواز، تستر، جند سابور وغیرہ ایرانی شہروں کا جو علاقہ ہے۔ اس میں بصنّی نامی بھی ایک آبادی تھی۔ وہ بھی پارچہ بافی میں مشہور مقام تھا۔ اسی کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

وبصنی تعمل الستور المشهورة فی جمیع الارض المکتوب علیها "عمل بصنی" (ص ۱۷۵)	البصنّی میں وہی پردے بنتے ہیں جو روئے زمین میں مشہور ہیں ان پردوں پر لکھا ہوا ہوتا ہے۔ "عمل البصنّی"

کاش! پھر آنکھیں "میڈ ان مانچسٹر" اور "میڈ ان لنکا شائر" کی جگہ "عملِ کابل" کپڑوں پر خواہ وہ اونی ہی ہوتے لکھا دیکھیں لیکن اونی تو اونی یہ مسلمان سیاح اپنی چشم دید گواہی یہ ادا کرتا ہے کہ کابل میں روئی کے کپڑے اتنی کثیر مقدار میں تیار ہوتے تھے جو وہاں کی مقامی ضروریات سے بچنے کے بعد ایک طرف مشرقِ بعید میں چین تک جاتے تھے اور خراسان و ہندوستان کی ضرورت بھی ان سے پوری ہوتی تھی۔ کیا اب وہی کابل ہے؟ یقیناً اس کی زمین بھی وہی ہے اور اس کا آسمان بھی وہی ہے اور کیا تعجب ہے کہ اسی سرزمین میں آسمان پھر اس تماشے کے دہرانے کا موقعہ عطا کرے لیکن سچ پوچھئے تو یہ "مصنوعات" کے عنوان کے تحت درج ہونے کی چیزیں ہیں اور ان کے لئے الگ مضمون بلکہ شاید کتاب کی ضرورت ہے۔ انہی جغرافیائی مورخین کی کتابوں میں اس کا بہت کافی مواد ہے۔ طبیعت اگر کبھی مستعد ہوئی تو ممکن ہے کہ اس کام کو میں کبھی کر دوں۔ ورنہ امید ہے کہ کوئی اور صاحب تھوڑی سی محنت برداشت کر کے اس کام کو پورا کریں گے۔ اس وقت تو لباس اور کھانے پینے کا ذکر ہو رہا

تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا تمدنی اشتراک مسئلہ لباس میں پایا جاتا تھا۔ یہی کیفیت ان کے اکل و شرب کی بھی ہے۔ جسکی ایک وجہ تو وہی تھی کہ اسلام نے جن چیزوں کے کھانے پینے کو حرام کر دیا تھا۔ عام اسلامی ممالک میں وہ حرام سمجھی جاتی تھیں۔

مسلمانوں میں شراب سے بے رغبتی

ہاں بعض بدبخت سلاطین اور امراء رہے اسمیں کوئی شبہ نہیں کا اور نو کسی چیز میں نہیں لیکن "شراب نوشی" میں افسوس ہے کہ اپنے آپکو اسلامی حدود پر قائم نہ رکھا۔ اور ان ہی باتوں کو تبنگڑ بنا کر متورخین خصوصاً مغربی مؤرخین نے مزے لے لے کر پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان تمام کتابوں میں جن کا میں ذکر کرتا چلا آرہا ہوں' ان کے مصنفین نے ہر طرح کی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ کسی جگہ کے مسلمانوں کی شراب خواری کا بھی انہوں نے تذکرہ کیا ہو۔ بلکہ ابن حوقل کا ایک لطیفہ اس موقعہ پر قابل ذکر ہے۔ ہندوستان ہی کے ساحلی شہروں کا تذکرہ کرتے ہوئے یعنی ماہل' سندان' صیمور' کھمبات' جہاں ظاہر ہے کہ اس وقت تک اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ صرف تھوڑے سے مسلمان آباد ہو گئے تھے ان ہی کے ذکر میں یہ لکھتے ہوئے کہ:۔

"ان شہروں میں جامع مسجدیں پائی جاتی ہیں۔ اور مسلمان اسلامی احکام کی پابندی علانیہ کرتے ہیں۔

آگے یہ بیان کیا ہے کہ:۔

"ان شہروں میں ناریل کے درخت بھی ہیں۔ اسی ناریل سے سرکا اور شراب بناتے ہیں۔ جس سے نشہ بھی پیدا ہوتا ہے اور لذیذ بھی یہ

لوگ استعمال کرتے ہیں۔ جو مصر والوں کا نبیذ ہے"

لیکن معاً اس فقرے کے بعد ہی وہ لکھتا ہے کہ:۔

لا واللہ ما اعرفہ ولا رأیتہ — خدا کی قسم میں اس کو نہیں جانتا اور نہ اسکو

ولا ادری ای شئ ھو ولا — دیکھا ہے اور نہ اس سے واقف ہوں کہ وہ

کیف کیفیتہ۔ (ابن حوقل صفحہ ۲۳۱) — ہے کیا چیز۔ اور اس کا مزہ کیسا ہے۔

یہ فقرہ اس کے قلم سے بے ساختہ نکل گیا ہے۔ میں نے جب اسکو پڑھا تو خیال آیا کہ مسلمانوں کے شہروں اور آبادیوں میں شراب نوشی اگر واقعی اسی قدر عام ہو چکی تھی جیسا کہ موجودہ زمانے کے مؤرخین لکھتے ہیں۔ خصوصاً اسلامی تمدن کے علم کے مدعیٔ اعظم جرجی زیدان نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ:۔

"لیکن مسلمانوں کا عام گروہ سو وہ تو مسکرات اور نشہ آور چیزوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور ان کی مختلف قسموں کو وہ استعمال کرتا تھا یہی حال ان کا ہر زمانے میں تھا۔ یعنی ان دنوں میں بھی جب ان کے حکام مسکرات سے پرہیز کرتے تھے۔ پھر خیال کرنا چاہیئے کہ ان کے حکام ہی جب پینے لگے، تو اب عوام کو کون روک سکتا تھا"

(التمدن الاسلامی صفحہ ۱۲۱ ج ۵)

یہاں کیا؟ ہر جگہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان لوگوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر یہی غلطی کی ہے۔ وہ مسلمان سلاطین اور امراء پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام امت کو قیاس کر لیتے ہیں لیکن میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اس وقت بھی یہی کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی صحیح ذہنیت کا ان لوگوں کو اندازہ نہیں ہے۔

اب آپ دیکھئے کہ ابن حوقل جیسا کہ آدمی جسکی زندگی کا اکثر حصہ سیر و سیاحت ہی میں بسر ہوا ہے وہ شہروں قصبوں دیہاتوں الغرض ہر قسم کی آبادیوں میں گھومتا رہا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ عام مسلمانوں میں شراب نوشی کا رواج اگر اسی طریقہ سے ہوتا جیسا کہ اسلامی تمدّن کے اس مدعیٔ علم نے دعویٰ کیا ہے تو اسکی نظر سے شراب کبھی نہ گذرتی اور اسکے حالات سے وہ اتنا ناواقف ہوتا؟ جیسا کہ اسنے بیان کیا ہے اور بالفرض مان لیا جائے کہ اس کا یہ بیان غلط سہی۔ حالانکہ اسکی کوئی وجہ نہیں ہے اس شدّت کے ساتھ شراب کے متعلق اپنی ناواقفیت کا احساس یقیناً اس کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ کہ عام مسلمانوں کو اس سے سخت نفرت تھی اور ان ہی کے جذبات کی رعایت سے وہ بے ساختہ ان الفاظ کے لکھنے پر مجبور ہوا ہے۔

عام مسلمانوں میں شراب نوشی کا عمومی رواج کسی اسلامی ملک میں کبھی نہیں رہا ہے۔ یوں چھپ چھپا کر پینے والے پیتے ہوں۔ لیکن کھلے بندوں دوسری جائز چیزوں کی طرح مسلمانوں نے شراب اور نشہ آور چیزوں کو کبھی استعمال نہیں کیا ہے ہاں! نبیذ کا رواج بعض ممالک میں رہا ہے لیکن اس کو الخمر کہنا غلط ہے اور ایک شرعی مسئلہ ہے جسکی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے نبیذ کو شراب قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے سرکہ کو کوئی شراب ٹھہرائے۔ کیونکہ سرکہ ہو یا شراب یا نبیذ ایک ہی چیز کے مختلف مدارج کی تعبیر ہے۔ صفات کے بدلنے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔

بہر حال دروغ بیانی کی تہمت خواہ مخواہ ایک شخص پر جوڑنے کی ضرورت نہیں خصوصاً جب ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ابن حوقل نماز روزے کا بھی پابند تھا۔ وہ بلغار جو روس کے قریب دریائے اتل پرتاتاری مسلمانوں کا قدیم پرانا شہر ہے ابن بطوطہ

نے تفصیل کے ساتھ جس کا حال اپنے سفر نامے میں بیان کیا ہے اُسی شہر کے متعلق اوقاتِ نماز کا جو مسئلہ ہے اُسی کا تذکرہ کرتے ہوئے ابنِ حوقل نے بھی لکھا ہے کہ:۔

"گرمیوں میں ان لوگوں کے یہاں رات اتنی ہی مختصر ہوتی ہے کہ چھ میل بھی آدمی آسانی سے چل نہیں سکتا کہ صبح ہو جاتی ہے اور میں نے اس کا خود مشاہدہ کیا ہے جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ میں سردیوں کے موسم میں ان لوگوں کے پاس پہنچا تھا۔ دن ان لوگوں کا اتنا ہی مختصر اس زمانے میں تھا کہ دن کی چاروں نمازیں (صبح۔ ظہر۔ عصر۔ مغرب) اس طرح ہوتی تھیں کہ مسلسل ایک نماز کے بعد دوسری نماز ہم اس طرح پڑھتے جاتے تھے کہ درمیان میں صرف اذان اور اقامت کا وقفہ ہوتا تھا۔"[1] (ابن حوقل صفحہ ۲۸۵)

بہر حال میرے نزدیک یہ قطعاً غلط خیال ہے کہ سلاطین اور امراء کی شراب نوشی پر قیاس کر کے یہ حکم لگا دیا جائے کہ عموماً مسلمان بھی مسکرات میں ڈوبے ہوئے تھے۔

سسلی کے مسلمانوں کی عاداتِ قبیحہ

ہم دیکھتے ہیں، اسی ابنِ حوقل کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس قسم کے جزئیات تک کو نوٹ بیان کرتا ہے۔ مثلاً سسلی کے مسلمانوں کا حال بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے:

"یہاں کے باشندے کثرت سے پیاز کھاتے ہیں۔ ان لوگوں کے حواس کی خرابی کا سبب بھی پیاز خوری ہے۔ بالکل کچی پیاز بر چباتے رہتے ہیں ان میں ایسا کوئی نہیں ہے جو کچّی پیاز روزانہ کھاتا ہو۔ بلکہ ہر گھر میں

(۱؎ حاشیہ اگلے صفحے پر)

صبح و شام یہ پیاز کھاتے رہتے ہیں اور بڑے سے چھوٹے تک باشندوں کے ہر طبقہ میں اس کا عام رواج ہے۔ دراصل اسی چیز نے ان کے تخیل کو بگاڑ دیا ہے۔ اسی نے ان کے دماغوں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ حواس اس کے ٹھکانے نہیں رہے۔ عقلیں انکی الٹ پلٹ گئی ہیں۔ سمجھ بگڑ گئی ہے۔ چہرے کی رونق بھی اسی کے استعمال نے اڑا دی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ واقعات کی صحیح صورت ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔" (ابن حوقل ص۸۷)

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس نے پیاز کے متعلق اتنی باتیں لکھی ہیں۔ جن لوگوں میں شراب نوشی کی عام عادت دہ پاتا گیا اسکا ذکر وہ ترک کر دیتا۔ میرے خیال میں ان لوگوں کا ذکر نہ کرنا یقیناً اسکی دلیل ہے کہ عام مسلمانوں میں شراب نوشی کا عمومی رواج کسی اسلامی ملک میں کبھی نہیں رہا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اچھی بات ہو یا بری۔ مسلمان مؤرخین چونکہ محض واقعات کا اظہار اپنا فرض سمجھتے تھے کسی خاص مضامین کو پیش نظر رکھکر کتابیں نہیں لکھا کرتے تھے۔ جیسا کہ اس زمانے کا دستور ہے اسلیے وہ کسی چیز کو نہ چھپاتے ہیں اور نہ واقعات کو بڑھا چڑھا کر، مرچ لگا کر بیان کرنیکے وہ عادی ہیں۔ آپ دیکھیے یہی ابن حوقل کہ مغربی افریقہ کے شہر سوس کے مسلمانوں میں اسنے جو باتیں دیکھی تھیں بے کم و کاست بیان کر دیں۔ دیکھتا ہے کہ:

"اس شہر کے باشندے دو فرقوں میں منقسم ہیں ایک موسویہ کے نام سے مشہور ہیں اور موسیٰ بن جعفر کے معتقد ہیں۔ ان کے مزاج میں سختی اور طبیعت میں اکھڑ پن

(حاشیہ پچھلا) گویا اس کے معنی یہی ہوئے کہ چاروں نمازیں ایک ساتھ ان لوگوں کو پڑھنی پڑتی ہونگی۔ اور اس کے بعد رات ہو جاتی ہوگی۔ اس وقت عشاء کی نماز پڑھکر فارغ ہو جاتے ہونگے۔ زندگی کا نظام ان لوگوں کا بھی کوئی ہوگا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ آخر اتنی لمبی چوڑی رات کیسے گذارتے ہونگے۔ بظاہر کاروبار زیادہ تر راتوں ہی کو انجام دیتے ہونگے ۱۲

پایا جاتا ہے اور دوسرا فرقہ سنیوں کا ہے جو امام مالکؒ کے پیرو ہیں۔"

اس کے بعد جو واقعہ ہے ان الفاظ میں اس کا اظہار کرتا ہے:-

"ان دونوں فرقوں میں رات دن لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ اور دوامی خونریزی ان میں جاری رہتی ہے۔ انکی ایک ہی مسجد ہے جس میں دونوں فرقے کے افراد اپنی اپنی نمازیں جدا جدا ادا کرتے ہیں۔ جب ایک فرقہ والے نماز ادا کر لیتے ہیں۔ تب .... دوسرے فرقے والے آتے ہیں۔ اذان دیتے ہیں اور اقامت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ گویا ان کی مسجد میں دس اذانیں اور دس اقامتیں ہوتی ہیں۔ ان میں جو مالکی ہیں وہ موسویوں سے (جو شیعہ ہیں) طبیعت کی سختی میں اور اخلاق کی خرابی میں اسی قدر بڑھے ہوئے ہیں۔ جتنی ان کو فارغ البالی حاصل ہے۔ جہل اور غصہ میں حد سے گذر جاتے ہیں۔" (صـ۹۶)

اسی سے مسلمان مؤرخین کی سادگی اور صداقت کا اندازہ ہوتا ہے اور جیسے اس نے سوس کے مسلمانوں کا یہ حال بیان کیا ہے۔ اگرچہ اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے مذہبی جھگڑوں کی نوعیت مسلمانوں میں بعض خاص خاص مقامات ہی تک محدود تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا ہے کہ سوس کے سوا ابن حوقل یا اسی سلسلہ کے دوسرے مؤرخین نے اسلامی فرقوں کے باہمی اختلافات کے نتائج کے متعلق اس قسم کی باتیں کہیں اور بیان کی ہیں۔ یعنی خونریزی تک نوبت پہونچ جاتی ہو۔ میری نظر سے اسکی نظیر کسی دوسرے اسلامی ملک کے متعلق نہیں گذری ہے۔ ہاں! سسلی کے منحوس مسلمانوں کی پیاز خوری کی بد عادت کے سلسلے میں اسی ابن حوقل نے ایک بات یہ ضرور لکھی ہے۔

یعنی پہلے تو یہ بیان کیا ہے کہ سسلی کے مسلمانوں کی کثرتِ آبادی کا اندازہ انکی اس مسجد سے ہوتا ہے کہ :-

"جس کا میں نے اندازہ کیا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ بھر جانے کی صورت میں سات ہزار اور کچھ زائد نمازیوں کی گنجائش اس مسجد میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جسکی وجہ یہ ہے کہ اس مسجد میں میں نے دیکھا کہ نماز کیلئے ۳۶ صفوں سے زیادہ صفیں قائم ہوتی ہیں۔ اور ہر صف میں ۲۰۰ آدمیوں سے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔"

لیکن اسی کے ساتھ اس نے بیان کیا ہے کہ :-

"اس شہر میں اتنی مسجدیں ہیں۔ جن میں کچھ تو اپنی اصلی حالت میں قائم ہیں اور کچھ شہید ہو گئی ہیں۔ ان سے شہر بھرا پڑا ہے۔ فصیل کے اندر اور فصیل سے باہر، عام محلوں میں ہر جگہ مسجد ہی مسجد ہے۔"

آخر میں مساجد کی کثرت کی وجہ سے یہ بیان کرتا ہے۔ وہیں کے ایک عالم جن کا ابو محمد القفصی الفقیہ الوثائقی نام تھا اور غالباً ابن حوقل کے میزبان تھے انہی سے مسجدوں کی کثرت کی وجہ اس نے پوچھی کہا تنے قریب قریب میں لوگوں نے یہاں کیوں بلا ضرورت مسجدیں تعمیر کی ہیں تو اس سے کہا گیا کہ :-

"یہاں کے باشندوں کے دماغ میں نخوت کی ہوا بھری ہوئی ہے اسی لئے ان میں ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ اسکی مسجد الگ ہو۔ کسی دوسرے کی شرکت اس میں نہ ہو۔ بس خود اور اسکے گھر کے لوگ اور خدام و حاشیہ نشینوں کے سوا اسمیں کوئی دوسرا نہ رہے۔"

پھر اپنی چشم دید شہادت بیان کرتا ہے :

"بسا اوقات دو حقیقی بھائی جنکے مکانوں کی دیواریں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں لیکن ہر بھائی کی مسجد الگ ہے ہر ایک نے اپنے لئے الگ مسجد تعمیر کرائی ہے۔" (ص۸۴)

پھر ان ہی فقیہ صاحب کے متعلق (جن کا ابن حوقل مہمان تھا) بیان کرتا ہے کہ:۔

"ایک تیر پرتاپ کے فاصلہ میں دس مسجدیں مجھے نظر آئیں ان ہی مسجدوں میں ایک مسجد تو وہ ہے جس میں ابو محمد القفطی نماز پڑھتے ہیں اور بیس قدم کے فاصلہ پر اس مسجد سے ایک اور مسجد ان ہی فقیہ صاحب کے صاحبزادے کی ہے۔ یہ مسجد صاحبزادے صاحب کے لئے تعمیر کرائی گئی ہے تاکہ اس میں وہ تعلیم حاصل کریں لیکن دراصل غرض ان میں سے ہر ایک کی صرف یہ ہے کہ فلاں کی مسجد کے نام سے یہ مسجد مشہور ہو اس کے سوا اور کوئی دوسری نیت نہیں ہوتی" (ص ۲۸۴)

خراسانی مسلمانوں کا دینی جذبہ

ہم نے غالباً پہلے بھی ابن حوقل کے حوالہ سے لکھا ہے یعنی ایک طرف تو وہ اس زمانہ کے خراسانی مسلمانوں کی تعریف میں رطب اللسان ہے کبھی لکھتا ہے کہ:۔

"جہاد کرنے میں ان خراسانی مسلمانوں سے اپنی طاقت، قوت، جوش کے لحاظ سے اسلامی ممالک میں کوئی ملک ان کے جوڑ کا نہیں ہے۔"

کبھی لکھتا ہے کہ:۔

"انہیں جن لوگوں کا حکومت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے، ان کا بھی حال یہ ہے کہ باوجود اتنی بُعد مسافت کے حج کا انتہائی ذوق ان لوگوں پر غالب ہے۔ صحرا کے (جو خراسان اور عرب کے درمیان واقع ہے) قطع کرنے میں ان سے زیادہ جری کوئی نہیں ہے۔"

مسلمانوں کے زوال کے آثار

بہرحال ان کی شجاعت، بہادری، مہمان نوازی، دینداری کی تعریف کرتے ہوئے ان ہی کے مقابلہ میں وہ اندلس میں چوتھی صدی کے مسلمانوں کا حال ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ یعنی ان کی رفاہیت و دولت و ثروت سب کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:۔

"اس جزیرے کا یہ عجیب حال معلوم ہوتا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ان کا قبضہ اس ملک پر باقی کیسے ہے؟ یعنی عقلیں ان کی اتنی کوتاہ ہیں اور قوت، دلیری، بہادری، شہسواری، بے جگری اس قسم کے تمام صفات، جنکی ضرورت میدانِ جنگ میں لڑنے والوں سے مقابلہ کرتے وقت پڑتی ہے، ان سے انہیں دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔"

پھر انہیں اندلسی مسلمانوں کی پیشانی کی لکیروں کو پڑھکر جو باتیں اس کے خیال میں آئیں اُن کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

"مغرب میں اگرچہ دولت و امارت کے لحاظ سے ان قرطبہ والوں کے برابر کسی دوسری جگہ کے لوگ نظر نہیں آتے، ان کے لباس بہترین ہیں زیور کی ان کے یاں کثرت ہے، اگرچہ دیکھنے میں وہ کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے مگر باوجود اس کے اس شہر کی فوج میں مجھے کوئی ایسی بات نہیں نظر آئی جو آنکھوں کو بھلی معلوم ہو، نہ ان بیچاروں کو شہسواری آتی ہے، نہ اسکے قواعد و قوانین سے یہ واقف ہیں، نہ بہادری کا کوئی جذبہ ان میں ہے۔"

پھر چند سطروں کے بعد لکھتا ہے کہ:۔

"ان کے لباس بڑے پاکیزہ صاف ستھرے ہیں۔ زندگی بڑے عیش و تنعم کی ہے اور عوام تک کو حاصل ہے تقریب تقریب ہر ایک ان میں خدام سے کام لینے کا عادی ہے بہت کم ان میں ایسے ہیں جو ایک گھر سے دوسرے گھر یا شوہر اپنے گھر سے بیوی کے گھر بغیر سواری کے جاتا ہو اور سواری بھی بڑی شان و شوکت کی ہونی چاہیئے۔ یہ لوگ محنت اور پیدل چلنے کے عادی نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مزدور اور نچلے طبقے کے لوگ پیدل چلتے ہوں تو چلتے ہوں لیکن سواری میں ان کی زیادہ تر خچر استعمال ہوتے ہیں۔ خچروں کے متعلق یہاں کے باشندوں میں مقابلہ جاری ہے اور جس کے پاس جتنے زیادہ خچر ہوں اس پر اسے ناز ہوتا ہے۔"

پھر ان خچروں کے متعلق کچھ دوسری باتیں کہ کہاں سے لائے جاتے ہیں اور کس طرح تیار ہوتے ہیں۔ آخر میں لکھتا ہے:

"میں نے خچروں کو اس شہر میں دیکھا کہ ان کی قیمت پانچ پانچ سو دینار تک پہنچ جاتی ہے باقی سو دو سو اشرفیوں کی قیمت والے تو ان کی تعداد بے شمار۔ مگر یہ لوگ خچروں میں یہ نہیں دیکھتے کہ چلنے میں تیز ہیں یا نہیں یا چال اس کی کیسی ہے۔ بلکہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ … کم ہیں … نقش و نگار ان کے کیسے ہیں دیکھنے میں خوبصورت معلوم ہوتے ہیں یا نہیں پیٹھ ان کی اونچی ہے یا پست بڑے تیجے مضبوط ہیں یا نہیں۔"

(ابن حوقل ص ۷۶)

اگرچہ کچھ غیر ضروری امور کا ذکر بیان کیا۔ لیکن مجھے دو باتیں ثابت کرنی تھیں ایک تو

مسلمان مؤرخوں کے طریقۂ بیان کی خصوصیت کا اظہار مقصود تھا یعنی محض اسلیے کہ اپنی قوم کا حال ہم چونکہ بیان کر رہے ہیں اسلیے وہ ایسا نہیں کرتے کہ صرف ان کے اچھے پہلو کو نمایاں کر کے کمزور پہلوؤں پر ان کے پردہ ڈال دیں ——————

آپ دیکھ رہے ہیں کہ جس علاقے کے مسلمانوں میں جو باتیں اُن کو نظر آتی ہیں بلا رو رعایت وہ انکو بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور دوسری بات جس سے انکی بصیرت اور روشن ضمیری کا ثبوت ملتا ہے سسلی اور اندلس کے مسلمانوں میں تباہی کے آثار کا احساس ہے جو انکو اسی زمانے میں ہو چکا تھا جس کا تماشہ چند ہی دنوں بعد دیکھا گیا اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان جس علاقے میں بھی تباہ ہوئے ہیں۔ اپنے ہی ہاتھوں تباہ ہوئے ہیں چوتھی صدی ہجری کا زمانہ اندلس اور سسلی کے مسلمانوں کا وہ زمانہ تھا کہ عروج کے بعد زوال کی طرف وہ تیزی سے جا رہے تھے بظاہر ابھی انکی شان و شوکت میں کمی نہیں ہوئی تھی لیکن اسلامی مؤرخ کی نگاہوں کے سامنے ان کا انجام جھانک رہا تھا۔ بخلافِ خراسان کے مسلمانوں کے کہ انکے اقبال کا آغاز تھا۔ نتائج نے دونوں کے متعلق ان مؤرخین کی رائے کی تصدیق کی بعد کو خراسانی مسلمانوں کو بھی وہی عوارض لاحق ہوئے جن میں مغرب کے مسلمان مبتلا ہو چکے تھے۔ پھر انکا انجام بھی انکے سامنے آگیا۔

وما ظلمنا ہم ولکن کانوا انفسہم یظلمون

ایک موقعہ پر ابن حوقل قدرت کے اس اٹل قانون یعنی :-

فاکثروا فیھا الفساد فصب علیہم ربک سوط عذاب (سورۃ الفجر)

پھر لگاتار انہوں نے بڑھا دیا (یعنی غالب کر دیا) پس برسائے تیرے رب نے ان پر عذاب کے کوڑے

خود بھی اعادہ کیا ہے اور اپنی چشم دید شہادت اس نے پیش کی ہے۔ جب اس بحث کی

طرف جھکے ہوئے ہیں آ ہی گیا ہوں تو اس کا ذکر بھی کیوں نہ کروں؟ واقعہ بڑا عبرتناک ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ابنِ حوقل جب آذربائیجان پہنچا ہے اور اس علاقے کے سب سے اہم مرکزی شہر اردبیل میں داخل ہوا ہے تو اس وقت وہاں اسکو عجب تماشا نظر آیا لکھتا ہے کہ:۔

"اس شہر کے اردگرد ایک عجیب وغریب فصیل کی دیوار محیط تھی لیکن ۳۳۱ھ میں اس عجیب وغریب شہر پناہ کو سالار مرزبان بن محمد بن مسافر نے توڑ پھوڑ کر زمین کے برابر کردیا۔"

اور خود نہیں توڑا بلکہ عبرت کا مقام ابنِ حوقل ہی کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ:۔ مرزبان بن محمد بن مسافر نے جب اس شہر پر حملہ کیا اور شہر والوں نے تنگ آ کر امان مانگی تو صلح کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس شہر کے باشندے اپنے ہاتھوں سے اپنے شہر کی اس فصیل کو توڑ دینگے جو ان کے کبر وناز کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اس کا بیان ہے کہ:۔

"پھر خود اس شہر کے بڑے بڑے تاجر اور خوشحال باشندوں کے ہاتھوں سے یہ دیوار تڑوائی گئی اور اس طور پر منہدم کرائی گئی کہ شہر کے معززین ارباب جاہ وجلال اپنے ہاتھوں میں پھاوڑے لئے ان ہی کپڑوں میں جو عطر میں بسے ہوئے ہوتے' آتے' ان کے ساتھ شہر کے تاجر بھی ہوتے' دیوار کو گراتے اور اپنی قیمتی طیلسانوں اور عباؤں اور جبوں میں بھر بھر کر مٹی اور پتھر

پھینکتے. حالانکہ ان میں اس بوجھ کے اٹھانے کی صلاحیت بھی نہ ہوتی
اس لباس میں جس میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے اس کام کو
انجام دینا پڑا۔ تا اینکہ پوری دیوار اس طرح غائب ہو گئی کہ گویا آج
اسکا یہاں پتہ بھی نہیں ہے اور اس کے بعد انکے پاس جو کچھ تھا وہ بھی
رفتہ رفتہ سالار کے شدید مطالبات کی بنیاد پر ختم ہو گیا۔"

اس دردناک قصے کو بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے :۔

" یہ سب جو کچھ بھی ہوا۔ درحقیقت خود اس شہر کے باشندوں کے طرزِ عمل کا
نتیجہ تھا. ان میں بدترین قسم کا تمرّد اور بری طرح کی سرکشی پھیل گئی تھی
دھوکا اور فریب کو انہوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ ان لوگوں نے
شیطان کے دامن کو تھاما تھا عصیان اور شورش کو انہوں نے
اپنا طریقہ کار بنا لیا تھا مسافروں کا مال انکے یہاں لوٹا جاتا تھا
اور ان بے چاروں کا خون گویا مباح تھا۔"

آخر میں اس شہر کے باشندوں کی اخلاقی تباہی کا ایک جزئی قصہ بھی نقل کیا ہے لکھا ہے کہ:۔

" ایک سے زیادہ آدمیوں نے مجھے یہ قصہ سنایا ہے کہ اس زمانہ کا حال
یہ تھا کہ قصاب کی دکان پر لوگ گئے ہیں جو گوشت وہ دے رہا ہے اگر
خریدار کے منہ سے اتفاقاً یہ نکل گیا کہ بجائے اس کے دوسرے عضو کا
گوشت دو بس قصاب آپے سے باہر ہو جاتا اور بیچارے خریدار کی
چادر پھاڑ کر اسکی دھجیوں کو گوشت پر ڈال دیتا۔ یا کبھی خریدار کی آستین
نوچ لیتا یا اسکے رومال کو پرزے پرزے کر کے شرارت اور بدمعاشی سے

بجائے گوشت کے اسی کو گوشت پر ڈال دیتا۔ یہ تھا ان لوگوں کے طغیان اور سرکشی کا حال"۔

ابنِ حوقل نے اس کے بعد لکھا ہے کہ:۔

"پس خدائے حلیم کے حلم نے کچھ دن ان لوگوں کو ڈھیل دی لیکن کبتک۔ آخر قدرت کے قانون کی چکی گھومی اور اب یہ شہر اپنے منہ کے بل گرا پڑا ہے یعنی جس حال میں تھا اس حال کے لحاظ سے گویا کھنڈر ہی بن گیا ہے"۔ (ابنِ حوقل صـ۲۳۸)

اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے حقوق

مگر اسی کے ساتھ جہاں دوسرے قسم کے واقعات نظر آئے ہیں انہیں بھی بیان کرتا ہے آرمینیہ میں جب پہنچا ہے تو وہاں کے حالات درج کرتے ہوئے اُسنے لکھا ہے کہ:۔

اس علاقے میں زیادہ تر عیسائی آباد ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں بنی اُمیہ و بنی عباس والوں ہی کے زمانے سے کچھ معاہدات ہو گئے تھے اور ان ہی معاہدات کی بنیاد پر اب تک اپنے وطن پر قابض ہیں۔ البتہ معاہدات کی رُو سے جو مطالبات ان کے ذمہ عاید ہوتے ہیں۔ انہیں ادا کرتے ہیں۔ خراج کے طور پر ہر سال حکومت میں مقررہ رقم پیش کرتے ہیں پھر کچھ اور حالات کا تذکرہ کرنے کے بعد اُسنے لکھا ہے کہ:۔

"۳۲۵ھ تک یہ میرا مشاہدہ ہے کہ اُن سے جو معاہدہ کیا گیا ہے اور جن جن باتوں کی ذمہ داری لی گئی ہے۔ ان کی پوری پوری پابندی کی جاتی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ مذکورہ بالا سن تک میں نے دیکھا کہ اس علاقے سے غلامونکو

بغداد میں نہیں خریدا جاتا اور نہ کوئی انکی خریداری کو جائز سمجھتا ہے جسکی وجہ یہی ہے کہ انسے عقد ذمہ کا معاہدہ ہے[1] ابن حوقل صـ ۲۴۵

---

[1] موجودہ تاریخ کی کتابوں میں ایک ایسا نقشہ مسلمانوں کے تمدن کا کھینچا گیا ہے کہ وہ ساری دنیا کی قوموں کو زبردستی پکڑ پکڑ لاتے ہیں اور اپنا غلام اور اپنی لونڈیاں ان کو بناتے ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ غلام اور لونڈی بنانیکا رواج مسلمانوں میں ضرور تھا لیکن اس کے بھی کچھ قوانین تھے قاعدے تھے اور مسلمان انکی پابندی کرتے تھے جسکی ایک معمولی سی شہادت ابن حوقل کا بھی بیان ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ آج بھی جب یہی دیکھا جا رہا ہے کہ لوگ بڑے بڑے کارخانے جو قائم کرتے ہیں یا کانوں کی کھدائیوں کا کام اور اسی قسم کے دوسرے کاروبار جو کرتے ہیں تو لاکھوں لاکھ انسانوں کو ان کے گھر سے، در سے، ماں سے، باپ سے چھڑا کر ہی تو مزدوروں کی شکل میں کام لیتے ہیں۔ آپ ان علاقوں میں چلے جائیے جہاں اس قسم کے کاروبار کے مراکز قائم ہیں۔ انسانوں کی بھیڑ نظر آئیگی۔ جن کو کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں کے تھے کس قوم کے تھے پیٹ بھرنے لگا۔ زندگی کی ضروریات پوری ہونے لگیں۔ بس وہیں رہ پڑے۔ بھول کر بھی ان کو نہ اپنا وطن یاد آتا ہے نہ اقربا و اعزہ کا خیال آتا ہے اپنے حالات میں مست رہتے ہیں۔ کیا واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی ان غلاموں اور لونڈیوں کا یہی حال تھا؟ بلکہ سچ پوچھیے تو ان مزدوروں سے وہ زیادہ بہتر حال میں عموماً ہوتے تھے۔ کیونکہ جن سے ان کا تعلق ہو جاتا تھا اس گھر کے وہ ایک ممبر بنجاتے تھے ان کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا جاتا تھا جیسے گھر کے کسی آدمی سے کیا جاتا ہے۔ ان کی بیماری آزاری ہر حال میں ان کا آقا ان کی خبر لیتا تھا۔ انکی شادی بیاہ ان کے بچوں کی پرورش سب کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اسی لئے یہ غلام بھی اپنے آقاؤں کے ہی خواہ بنجاتے تھے۔ یہی خواہیاں بسا اوقات ان کو بلند سے بلند مقام تک پہنچا دیتی تھیں۔ اس زمانے کی تاریخ پڑھیے آپ کو معلوم ہوگا کہ غلامی بھی عروج

(باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال جہاں اردبیل کے مسلمانوں کی بے آئینی کا حال اس نے بیان کیا ہے اسی کے ساتھ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں کے باشندے آئین وقانون کے پابند ہیں اُن کا اظہار بھی اس نے کر دیا ہے۔

لہ اور ارتقاء کا ایک راستہ بنا ہوا تھا اسی راہ سے معمولی معمولی مناصب ہی نہیں بلکہ وزارت اور کتنے بادشاہی کے مقام تک ترقی کر کے پہنچے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس لحاظ سے ان غلاموں کا حال موجودہ زمانے کے کارخانوں کے مزدوروں سے یقیناً بہتر تھا۔ استثنائی حالات کو میں نہیں کہتا۔ لیکن عمومی طور پر مسلمان اپنے غلاموں کے ساتھ اچھا ہی برتاؤ کرتا تھا۔ اسی طرح ذمی اقوام جو مسلمانوں کی حکومت میں عہدِ ذمہ کو قبول کر کے آباد تھے اُن کا حال تو بسا اوقات عام مسلمانوں کے مقابلہ میں قابلِ رشک ہوتا تھا۔ ابنِ حوقل جب سمرقند کے علاقے میں پہونچا ہے تو خود اسکو بھی دیکھکر حیرت ہوگئی یعنی یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مسلمانوں کے جلال و جبروت کا پھریرا اس علاقے میں اُڑ رہا تھا۔ لیکن انہی دنوں میں وہ بیان کرتا ہے کہ "ساوُدار کا ایک خطہ ہے جو عیسائیوں سے آباد اور معمور ہے اس خطہ میں ان کا ایک بڑا مجمع بسا ہوا ہے انکے یہاں متعدد کلیسے ہیں جنہیں میں نے عراق کے بعض عیسائیوں کو بھی پایا۔ انہوں نے ان کلیساؤں کا انتخاب اسلئے کیا ہے کہ یہاں کی خوشگوار آب وہوا میں زندگی گذارنے کا موقعہ ملے، ان کلیساؤں پر اوقاف ہیں۔ یہ بلند مقامات پر بنے ہوئے ہیں۔ دریائے سغد کی طرف سب کا رُخ ہے۔ اس مقام کا نام "یوزکرد" ہے۔ ساوُدار جس کا میں نے ذکر کیا کہ اس میں عیسائی آباد ہیں اسکے مختلف کشادہ وسیع حصے ہیں۔ سب میں نہریں جاری ہیں جو مزارع میں بہہ بہہ کر گرتی ہیں۔ درمیان میں ان مبداؤں کے بڑا پرفضا حسین منظر ہے۔ بکثرت ہر طرف ہر قسم کے شکار کے جانور کلیلیں کرتے رہتے ہیں بڑا آباد سرسبز علاقہ ہے، زندگی کی تمام مسرتوں سے معمور ہے" (ابن حوقل ص ۳۷۲) آپ دیکھ رہے ہیں کہ سمرقند میں اس زمانہ میں نصرانی کتنے آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے ۱۲

کتاب گو اب ختم ہو رہی ہے۔ لیکن ان مسلمان سیاحوں کی ان کتابوں میں دلچسپ اور مفید معلومات کا ابھی ایک ذخیرہ باقی ہے۔ ممکن ہے کہ "معلومات" کے کسی دوسرے حصہ میں ان کا ذکر کیا جائے لیکن اسی حصہ کو ختم کرتے ہوئے چند باتیں اور سن لیجئے۔

ایران اور پارسی قوم

عام طور پر مشہور کر دیا گیا ہے کہ ایران پر مسلمانوں کے قبضہ ہونے کے ساتھ ہی پارسی قوم اس ملک میں باقی نہیں رہی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں ان کا ایک بچا کھچا قافلہ ہندوستان آ کر پناہ گزین ہو گیا۔ جس سے اس وقت اس قوم کا دُنیا میں نام و نشان باقی ہے۔ مگر یہ تو سُنا جا رہا ہے، پر دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ یہ ہے۔ ابنِ حوقل جو چوتھی صدی ہجری میں ایران آیا ہے لکھتا ہے :-

"فارس کا کوئی شہر اور کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جس میں آتشکدے نہوں، اور مجوسی (پارسی قوم) اس ملک کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ (ابنِ حوقل ص۱۸۱)

اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران سے بالکلیہ نیست و نابود ہو جانے کا جو افسانہ مشہور کیا گیا ہے کتنا بے بنیاد افسانہ ہے۔ باقی یہ سوال کہ چوتھی صدی ہجری تک ایران کی یہ سب سے بڑی اکثریت آخر زمانہ میں اکثریت کی شکل میں کیوں باقی نہ رہی، یہ الگ سوال ہے۔ جسکے جواب کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ سرِدست مسلمانوں سے خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں سے صرف اس قدر کہنا ہے کہ جس

اکثریت سے وہ ڈر رہے ہیں کاش! بجائے اسکے ڈر کے خدا کا ڈر اپنے دل میں پیدا کرتے تو ایران کی اس اکثریت کا جو حشر اس ملک میں ہوا۔ میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ چاہیں تو ہندوستان میں بھی وہ اس تماشے کو دیکھ سکتے ہیں۔

سفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر چاہے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے!

لیکن اپنے "اسی سامان" کا نام مسلمانوں نے عجمی تصوف رکھ چھوڑا ہے اور جو چیز خاص ان کے گھر کی تھی اسکے متعلق مغالطہ میں مبتلا کئے گئے ہیں کہ باہر سے ان کے گھروں میں وہ داخل ہو گئی تھی۔

خیر اس قصہ کو تو چھوڑیئے، میں ایران کی اسی مجوسی اکثریت کا ذکر کر رہا تھا۔ دلچسپ بات اسی سلسلہ میں ابن حوقل ہی نے لکھی ہے۔ یعنی مجوسیوں کے ان آتشکدوں سے مسلمانوں نے استفادہ کی عجیب راہ پیدا کی تھی کہ لکھنے پڑھنے کے لئے سیاہی کی جو ضرورت ہوتی تھی۔ نیز کپڑوں کی رنگوائی میں بھی آتشکدوں میں جمع ہونیوالی سیاہیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ یہ لکھنے کے بعد کہ:۔

"فارس کے علاقے میں دوات کے لئے بھی اور رنگ کیلئے بھی بہترین سیاہی اور روشنائی ملتی ہے اتنی بہتر کہ چین سے جو سیاہی آتی ہے اُس سے تو خیر فارس کی سیاہی بہتر نہیں ہے لیکن اسکے سوا روئے زمین میں ایسی سیاہی نہیں ملتی۔"

پھر یہ بتاتے ہوئے کہ سیاہی کا یہ ذخیرہ کہاں سے حاصل کیا جاتا ہے وہی رقمطراز ہیں:۔

"دوات والی روشنائی یا رنگ میں جو سیاہی کام آتی ہے دراصل یہ

اُس آگ سے حاصل کی جاتی ہے جو مجوسیوں کے آتشکدوں میں
قدیم زمانے سے جلتی چلی آرہی ہے۔" (ابن حوقل ص ۲۱۵)

آخر میں لکھتا ہے:۔

"ظاہر ہے کہ یہ سیاہی کیا ہے؟ دھوئیں کے سوا اور بھی کچھ ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ آتشکدوں کی سیاہیوں سے جو روشنائی تیار ہوتی تھی اس سے مسلمان کن کن چیزوں کو لکھتے تھے۔ اگر قرآن اور اسکی تفسیریں، حدیث اور اس کے شروح، فقہ اور اس کے فتاویٰ، وہ متون کی کتابوں کی کتابت میں یہی روشنائی استعمال ہوتی تھی تو شرک کے نتائج سے توحید کی اشاعت و تبلیغ کا یہ کام دلیل ہے اس بات کی کہ مخالف سے مخالف شے کو بھی اسلام کی تائید کا ذریعہ بنا لینے میں ان پرانے مسلمانوں کو کیسی عظیم مہارت حاصل تھی۔ رحمۃ اللہ علیہم وازقنی اللہ اتباعہم۔

فرغانہ کی معدنیات اور پتھر کا کوئلہ

اسی سلسلہ کی ایک چیز اور ہے۔ ابن حوقل ہی اس کا بھی راوی ہے۔ فرغانہ (ترکستان) کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھنے کے بعد کہ:۔

" اس علاقے میں سونے چاندی کے متعدد معادن ہیں۔ نیز نقادہ اور اخسیکت کے علاقوں سے طلا اور نقرہ برآمد ہوتا ہے۔ نیز پارہ بھی بکثرت یہاں کے پہاڑوں سے نکالا جاتا ہے۔ زفت (ڈامر) اور جراغنک بھی یہاں کی کانوں سے لوگ نکالتے ہیں۔ انہی

معدنوں سے لوہا اور رانگ بھی نکلتا ہے۔"

الغرض اسی قسم کی معدنی پیداواروں کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتا ہے کہ اسی خطہ میں:-

"اسبرہ نامی جو جگہ ہے وہاں ایک پہاڑ ایسے سیاہ پتھروں کا ہے جو جلتے ہیں۔ ٹھیک کوئلہ کی طرح آگ کو قبول کرتے ہیں۔"

ابن حوقل کی اسی عبارت پر فارسی زبان میں ایک نوٹ بھی درج ہے یعنی:-

درہ اسبرہ کوہہائے چند ہست کہ آں کوہہا مانند فحم سوختہ می شود و از سنگہائے آں کوہ بر سر بر خروار یک درہم مے فروشند۔ (ابن حوقل ص۲۹۱)

اسی اسبرہ میں چند پہاڑ ہیں جنکے پتھر کوئلہ کی طرح جلتے ہیں۔ ان پتھروں کو لوگ اس حساب سے فروخت کرتے ہیں یعنی ایک خروار (بار خر) ایک درم میں۔

یہ چوتھی صدی ہجری کا مشاہدہ ہے لیکن کہنے والوں کو کیا کہیئے۔ جو کہتے پھرتے ہیں کہ پتھر کے کوئلوں کے استعمال سے یورپ ہی نے دنیا کو واقف کیا ہے۔ اس سے پہلے لوگ اس کے استعمال سے واقف نہ تھے۔ حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ پتھر کے ان کوئلوں کی خرید و فروخت کا عام رواج فرغانہ میں اُس زمانہ میں تھا اور چین میں بھی جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں اور پتھر کے ان کوئلوں کے متعلق ابن حوقل ہی کے فارسی حاشیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:-

چوں سوختہ مے شود فحم آں را با آب مختلط و ممتزج می کنند و جامہا را بداں سپید کنند و بجائے صابون بکار برند (ایضاً)

جب پتھر کا یہ کوئلہ جل جاتا ہے تو اُسکو پانی میں لوگ گھول دیتے ہیں اور اسی پانی سے کپڑے کو صاف کرتے ہیں۔ صابن کی جگہ اسی کو استعمال کرتے ہیں۔

میں تو نہیں جانتا کہ پتھر کے ان کوملوں کے اس استعمال کا اب بھی دنیا میں رواج باقی ہے یا نہیں؟

بندرگاہ عمان کی ایک اسٹرائک

اور کن کن باتوں کو سوچیے آج سمجھا جاتا ہے کہ مزدوروں یا تاجروں یا مختلف کاروبار کرنے والوں کے ہاتھ میں اسٹرائک کا حربہ نیا حربہ ہے جو یورپ نے مظلوموں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے دیا ہے۔ لیکن سنئیے بزرگ بن شہریار اپنی عجائب الہند میں راوی ہے۔ قصہ تو طویل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ایک یہودی اسحاق نامی عمان کی بندرگاہ میں دلالی کا کام کرتا تھا اتفاقاً کسی دوسرے یہودی سے اور اس سے جھگڑا ہو گیا۔ عمان سے بھاگ کر اسحاق ہندوستان چلا آیا۔ جس وقت ہندوستان آیا تھا اس کے پاس کل پونجی دو سو اشرفیاں تھیں لکھا ہے کہ عمان سے تیس سال تک وہ غائب رہا ۳۰۰؁ ہجری میں وہ عمان پھر واپس ہوا اور بڑھے ٹھسک واحتشام سے واپس ہوا خود اپنا جہاز تھا جس پر تجارتی سامانوں کے ساتھ عمان کی بندرگاہ پر پہنچا، خلیفہ مقتدر باللہ عباسی کا زمانہ تھا۔ خلیفہ کی طرف سے عمان کی بندرگاہ کا کمشنر اس زمانے میں احمد بن ہلال تھا لکھا ہے کہ احمد بن ہلال کے ہاتھ اس یہودی نے ایک لاکھ مثقال وزن میں تو صرف مشک ہی فروخت کیا تھا اور بھی ہزار ہا ہزار روپے کی مختلف چیزیں مختلف لوگوں کے ہاتھ اس نے فروخت کیں۔ اسکی دولت کی رفتہ رفتہ شہرت بغداد پہنچی لوگوں نے سازش کا جال اس کے خلاف بچھایا اور مقتدر باللہ کو اس پر آمادہ کیا کہ اس یہودی کے مال کا جائزہ لے مقتدر کا آدمی عمان پہنچا اور احمد بن ہلال کے نام جب

معتضد باللہ کا خط اس یہودی کے بھیجنے کے لئے موصول ہوا۔ لیکن لبس یہی سُننے کی بات ہے کہ بلا وجہ ایک تاجر کے متعلق حکومت نے جو بدنیتی کا ارادہ کیا تھا اس سے مقابلہ کرنے کی تدبیر کیا اختیار کی گئی۔ بزرگ بن شہر یار نے لکھا ہے کہ:۔

غلقت الاسواق و	دکانیں بند کر دی گئیں اور خلیفہ کے نام
کتبت المحاضر وتنہد	معروضے لکھے گئے جن پر باہر والوں کے بھی
فیھا الغرباء والقاطنین	اور خاص عمان کے باشندوں کے بھی دستخط تھے
بانہ متی حمل ھذا الیھودی	ان معروضوں میں لکھا گیا تھا کہ اس یہودی
القطعت المراکب عن عمان	تاجر کو اگر بغداد زبردستی لوگ لیجائینگے
ولھرب التجار وانذر الناس	تو جہازوں کی آمد و رفت عمان کی بندرگاہ پر قطعاً
بعضھم بعضاً ان لا یطرق	روکدی جائیگی، تاجر بھاگ جائیں گے، لوگ اس خبر کو پھیلائینگے
احد ساحلاً من سواحل	کہ عراق کے ساحل پر کوئی نہ جائے اور نہ
العراق ولا یامن	کسی مال والے کو اپنے مال کی حفاظت کی
ذو مال علی مالہ	ضمانت باقی رہے گی۔

اسی قسم کی طویل عبارت کے بعد آخر میں خلیفہ کے نام کے اس میموریل میں لکھا تھا کہ:۔

"اس بندرگاہ عمان میں بڑے بڑے تجار اور ثروت و دولت والے اس اعتماد پر مقیم ہیں کہ امیر المومنین کے عدل و انصاف پر ان کو بھروسہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خلیفہ تاجروں کی خاص طور پر نگرانی کرتا ہے اور بُری نیت ان تاجروں کی دولت پر جو لوگ رکھتے ہیں ان کو اس کی تلوار نے مایوس بنا رکھا تھا"

بہر حال اسٹرانگ کے اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقتدر کا جو آدمی بغداد سے آیا تھا یہودیوں کے چھوڑ دینے پر مجبور ہوا۔

میری غرض اس واقعہ کے ذکر سے یہی ہے کہ اسٹرانگ اور ٹرنال کے جس طریقہ کو مغربی طریقۂ احتجاج قرار دیا جا رہا ہے۔ چاہیئے کہ لوگ اسکی بھی نظر ثانی کریں۔ اور اسی پر کیا غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا ایک طوفان ہے جسے مختلف راہوں سے یورپ نے دنیا میں پھیلا دیا ہے۔ لوگوں کا مطالعہ اگر وسیع ہو تو اس قسم کی بہت سی غلط فہمیوں کا وہ ازالہ کر سکتے ہیں۔

مختلف ممالکِ اسلامیہ کی لسانی خصوصیات

ان مسلمان سیاحوں کی کتابوں میں ایک دلچسپ چیز یہ ہے کہ بعض مقامات کی لسانی خصوصیات کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ اس علاقے میں زیادہ تر لوگ کن ناموں کو پسند کرتے ہیں۔ مقدسی کو اس کا بہت شوق ہے بلکہ اسی نے ایک مستقل باب اپنی کتاب میں اس کا باندھا ہے کہ ناموں کو لگاڑنے کے مختلف اسلامی ممالک میں اس زمانے میں کیا طریقے تھے۔

مثلاً نیشاپور والوں کی لسانی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ گو زبان تو انکی فارسی ہے لیکن خواہ مخواہ اکثر الفاظ میں سین کا اضافہ ان کی عام عادت ہے مثلاً بگفتی کو بگفستی بخردی کو بخرسدی بخفتی کو بخفستی اسی طرح الفاظ کو کھینچنے کا بھی خاص عارضہ ہے۔ خصوصاً گ ی کا اضافہ ان کے لہجہ میں بکثرت پایا جاتا ہے مثلاً بگو کو بگوی لیشو کو بشوی اسی نے مرو والوں کے متعلق لکھا ہے کہ فیہ طولا ومد ان کی زبان میں بڑی

کھینچ تان ہے بخارا والوں کے متعلق بھی لکھا ہے کہ خواہ مخواہ بلا ضرورت الفاظ بڑھاتے ہیں۔ مثلاً مردے کی جگہ یکے مردے کہیں گے۔ سمرقند والوں کی زبان کی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ وہ کاف اور قاف کی بھرمار زیادہ کرتے ہیں مثلاً بکردم کو بقردم، قم، بگفتم کو بقفتم کہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مقصد اس کے ذکر سے اسلامی سیاحوں کی خبررسی کی توجہ دلانی ہے۔ اہواز والوں کی زبان کی خصوصیت مقدسی نے یہ بتائی ہے کہ فارسی میں عربی الفاظ ٹھونسنے کے عادی ہیں۔ مثال دی ہے کہ این کتاب ومصلا کن، این کار قطعاً کن (المقدسی صـ۴۱۸)

ناموں میں تصرف کی عادت

ہندوستان کے بھی مختلف صوبوں میں ناموں کی تراش وخراش کا کافی رواج ہے غالباً ترخیم کے ناموں کے بگاڑنے کا عربی طریقہ تھا۔ مقدسی نے لکھا ہے کہ:-

"علی۔ حسن۔ احمد ناموں کو بگاڑ کر رے والے علکا۔ حسکا۔ حمکا کہتے ہیں اور ہمدان والے احمدلا۔ محمدلا۔ علیثلا۔ ساوہ والے ابوالعباس کو ابوالعباساں، حسن کو حسناں۔ جعفر کو جعفراں کہتے ہیں"۔ (مقدسی صـ۳۹۸)

مختلف علاقوں کے خصوصی نام

ایک باب مقدسی نے یہ بھی باندھا ہے۔ مثلاً لکھتا ہے کہ:-

"قم والے عموماً اپنی کنیت ابوجعفر رکھتے ہیں۔ اور اصفہان والے ابومسلم۔ قزوین والے ابوالحسین"۔